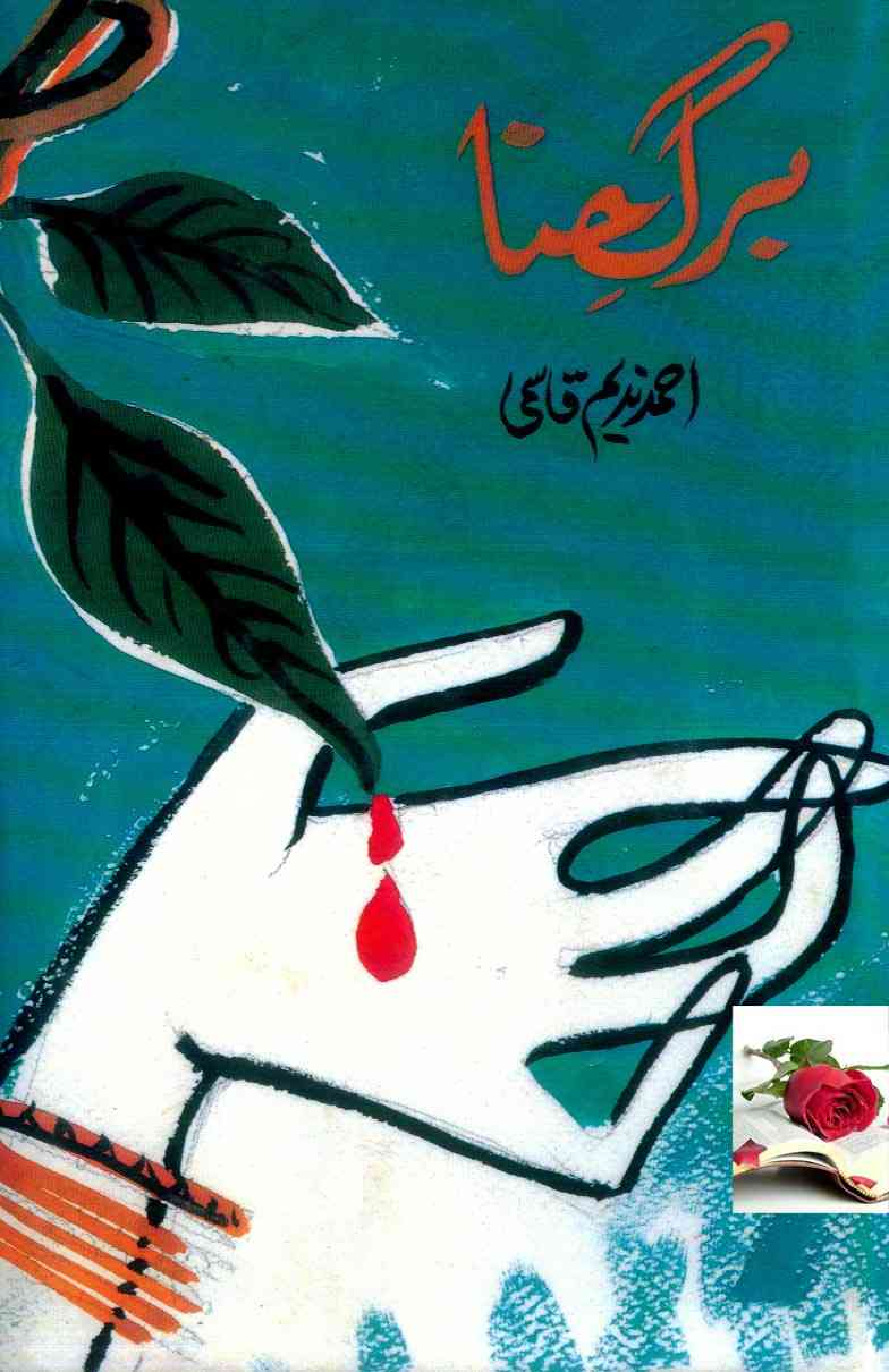

برگِ حنا
احمد ندیم قاسمی

پیارے منوہر

کے

نام!

ترتیب

بیٹے بیٹیاں

ہادی کمہار نے سوچا کہ کل تک تو نازو بالکل ٹھیک تھی۔ آخر آج اچانک اس کی آنکھوں میں چورنتیاں کیوں جلنے لگیں؟ نازو سے کٹورا لے کر اُس نے پانی تو پی لیا، مگر پانی پیتے ہوئے بھی وہ کٹورے کے اُفق پر سے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

نازو کٹورا لے کر چلی گئی اور ہادی پاؤں لٹکا کر چاک گھمانے لگا۔ چاک پر گھومتی ہوئی ہنڈیا اس کی انگلی کے لمس سے نئی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ہنڈیا اپنی تکمیل کی طرف جا رہی تھی۔

صبح اُٹھتے ہی جب ہادی کی نظر نازو پہ پڑی تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ بدلی ہوئی ہے اور اس کے گالوں میں کچھ ایسی چمک سی ہے کہ اتنی چمک چولھے میں ہو تو ہنڈیا میں پانی اُبلنے لگے۔

اسے وارث دادا یاد آ گیا، جو اپنی آٹھ بیٹیوں کی دُھوپ میں تپ کر کُندن ہو چکا تھا، وہ کہتا تھا "لوگو! بیٹیوں کی آنکھوں میں چورنتیاں جلتی دیکھو تو اُنہیں فوراً کہیں چلتا کر دو۔ چاہے انہیں گٹھڑی میں باندھ کر کسی کے دروازے پر ڈال آؤ۔ چورنتی جلتی رہے تو مسالہ ختم ہو جاتا ہے، اور دُنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ دُنیا بھر کے ماں باپ کے لئے ہر بیٹی کی عمر چودہ نہیں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد بیٹی مر جاتی ہے

اور عورت پیدا ہو جاتی ہے۔"

ہادی کو اتنا یاد تھا کہ جن دنوں لام لگنے کی باتیں ہو رہی تھیں تو اس کے ہاں مُراد پیدا ہوا تھا اور بیوی بیٹا دے کر خدا کے ہاں سدھار گئی تھی۔ پھر جب لام لگی ہے تو مُراد "ابا، اماں" بول لیتا تھا اور صحن میں بھاگتا پھرتا تھا۔ اس وقت نازو پانچ چھ سال کی تھی۔ میاں جی کے ہاں پہلا سیپارہ پڑھنے جاتی تھی اور اب مراد بارہ سال کا ہے اس حساب سے نازو کی عمر ہوتی یہی کوئی ——

ہادی کہار چارپائی پر سے گھبراہٹ میں اُترا۔ نازو اس وقت پڑوس سے مانگی ہوئی لسی میں مکھن کی ڈلی گھما رہی تھی۔ اس نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور بولی "کیا ہے بابا؟"

"کب سے اُٹھی ہوئی ہو تم؟" ہادی نے پوچھا۔

"دیر سے!" وہ حیران ہو کر بولی "مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔"

"تو مجھے کیوں نہیں اُٹھا دیا؟" وہ بولا "مجھ بدنصیب نے تو جب بھی فجر کی نماز پڑھی ہے، قضا ہی پڑھی ہے۔ اور تم؟ —— تم نے نماز پڑھی ہے؟"

"نہیں بابا!" نازو نے جھینپ کر کہا۔

"منہ اندھیرے لسی لانا یاد رہ گئی، نماز پڑھنا بھول گئیں بدنصیب؟" ہادی نے اُسے خلافِ معمول جھڑک دیا اور پگڑی کے پلّو سے آنکھیں ملتا ہوا باہر چلا گیا۔

ہادی کا معمول سا ہو گیا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی چادر کو ایک جھٹکے کے ساتھ پرے پھینک دیتا اور سوتی یا جاگتی ہوئی نازو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہر نئی صبح کے مس سے نازو نئی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک صبح کو تو وہ نازو کو ایک لمحے کے لئے پہچان ہی نہ سکا۔

اسوج کے دن تھے۔ راتیں بھیگ کر خنک ہو جاتی تھیں۔ آدھی رات کے بعد ہادی چادر اوڑھ لیتا اور جب صبح کو اٹھتا تو اس کے گھٹنے سینے سے لگ چکے ہوتے۔ ایک روز باپ بیٹی کوٹھے کے اندر سوتے مگر آدھی رات کو نازو اُٹھی، چادر بغل میں ماری، چارپائی کو گھسیٹ کر آنگن میں لے آئی اور جب کواڑ بجنے سے ہادی کی آنکھ کھلی اور اس نے نازو کو پکارا تو وہ بولی "میں یہاں ہوں بابا۔ اندر کے پسینے سے باہر کی ٹھٹھر ٹھٹھر بھلی۔"

ہادی خاموش ہو گیا، مگر کچھ دیر کے بعد اسے بھی محسوس ہوا کہ وہ پسینہ پسینہ ہوا جا رہا ہے۔ بستر بغل میں مار کر وہ بھی آنگن میں آ گیا، رات بھر خنکی کے مارے گٹھڑی بنا پڑا رہا اور صبح کو اُٹھا تو اُسے محسوس ہوا کہ کھری چارپائی پہ کوئی سو تو ضرور رہا ہے مگر وہ نازو نہیں ہے۔ وہ تو کوئی عورت ہے۔

نازو چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا کالا تہمد گھٹنوں تک چڑھ آیا تھا اور چھینٹ کا کُرتا اس کے جسم پر کچھ یوں کس گیا تھا جیسے اس نے ایک بھی گہری سانس لی تو جگہ جگہ سے مسک جائے گا۔ نازو کی چوٹی اس کی گردن کے ارد گرد سانپ کی طرح لپٹ گئی تھی اور جو چادر اس نے اُوپر اوڑھنے کی بجائے نیچے بچھالی تھی، وہ زمین پر ڈھیر پڑی تھی۔

اچانک نازو نے ایک عجیب سی کروٹ لی، کروٹ لیتے ہوئے اس نے جسم کو چارپائی کے موٹے بان کے ساتھ اتنی سختی سے رگڑا کہ بان چِھر چِھر بول اٹھا۔ وہ دائیں طرف پلٹی۔ پھر اُلٹی ہو کر بائیں کروٹ آ گئی، مگر رُکی نہیں، بلکہ پھر سے چت لیٹ گئی اور ہادی کو ایسا لگا جیسے نازو کے کُرتے کا تنہا بٹن، پٹاخے کی طرح ٹوٹ کر اسے ننگا کر دے گا۔ وہ نازو پر جیسے جھپٹا۔ اسے جھنجھوڑنے کے لئے جھکا، مگر بڑھتے ہوئے ہاتھ کو یوں کھینچ لیا، جیسے وہ بے جانے بُوجھے کسی غیر عورت کو چھونے چلا تھا،

پھر وہ قریب چلا آیا اور بولا "نازو"۔

نازو یوں ہڑبڑا کر اُٹھی کہ اس کے کُرتے کا بٹن سچ مچ ٹوٹ گیا۔ پھر وہ کوٹھے کے اندر لپک گئی اور ہادی باہر گلی میں آ گیا۔ وہاں بھی رُکا نہیں۔ بلکہ سیدھا نکلا چلا گیا، اور اس روز اس نے سب کمہاروں کے گھروں کے چکّر لگا ڈالے۔ وہ ہر گھر میں جوان کمہاروں کو دھواں چھوڑتے ہوئے آووں پر اُپلے چھاتے یا چاکوں پر اتنی تیزی سے برتن بناتے دیکھتا رہا جیسے برتن چاک میں سے اُگتے چلے آ رہے ہوں۔ ہادی بے ضرر سا کمہار تھا۔ نہ کسی کے لینے میں تھا نہ دینے میں۔ مہینوں اپنے گھر ہی سے نہیں نکلتا تھا اور کبھی نکلا بھی تو آوے سے اُترے ہوئے برتن بیچنے یا کسی کے آوے کا کوئی کونا کھدرا مانگنے تاکہ دوسروں کے گھڑوں اور ہانڈیوں کے ساتھ اس کے برتن بھی پک جائیں۔

آوے کا ایک حصہ تو وہ مانگ سکتا تھا۔ مگر اپنی بیٹی کے لئے بر کیسے مانگتا۔ بس بانکے سجیلے نوجوان کمہاروں کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے بچے مٹھائی کی طرف دیکھتے ہیں۔

نازو سے اسے حجاب سا آنے لگا تھا۔ وہ جب اس کے سامنے کھانا لا کر رکھتی یا اس کے ہاتھ میں لسی کا کٹورا تھماتی، تو ہادی کا جی چاہتا کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے اُس کی آنکھوں میں جھانکے کہ وہاں چوہ بتیاں ابھی تک جل رہی ہیں یا مسالہ ختم ہو چلا ہے۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں نازو چارپائی کے موٹے بان پر اپنے جسم کو چھیلتی ہوئی دوہری کروٹ لیتی اور اسے نازو سے وحشت ہونے لگتی۔ البتہ جب وہ خالی برتن لے کر واپس جاتی تو ہادی اس کی طرف دیکھتا۔ چند ہی دنوں میں اس کا قد کتنا لمبا ہو گیا تھا، اور اس کے بازوؤں کے خطوط کیسے دمکنے سے لگے تھے اور وہ بالوں کا اتنا بڑا ڈھیر گھر کے کس گوشے میں چھپ کر اُگا رہی تھی۔

اپنے گاؤں سے مایوس ہو کر وہ ایک دن قریب کے ایک اور گاؤں میں قسمت

آزمائی کرنے جا نکلا۔ چھوٹے سے اس گاؤں میں صرف ایک کمہار رہتا تھا، جو کسی پشت سے اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ اس کی دو جوان اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ عرصہ ہوا اس کی بیوی مٹی کھودتے ہوتے مٹی ہی کے ایک تودے کے نیچے دب کر مر گئی تھی۔ بیٹے بیٹی کو زندہ رکھنے کے لئے اُس نے دن رات چاک چلایا تھا اور چاک چلاتے ہوئے اس نے اتنی بار پاؤں کو حرکت دی تھی کہ بقول اس کے اگر کوئی چلتے ہوئے اتنی بار پاؤں ہلاتے تو کابل قندھار پہنچ جاتے۔

ہادی جب اس کے ہاں پہنچا تو پورا کنبہ بیری کے سائے میں، ایک رنگین گھڑے کے اردگرد جمع تھا۔ بیگو بیٹے بیٹی کو مشورہ دے رہا تھا اور وہ سُرخ رنگ پر سبز اور سنہری بیل بوٹے بنا رہے تھے۔ وہ اُن سے کہہ رہا تھا۔

"گلاب کے پھول اور گوبھی کے پھول میں بہت فرق ہوتا ہے دینو! اور دیکھ ری شرفی۔ تُو نے یہ چڑیا بنائی ہے کہ مولی؟"

دینو اور شرفی ہنس رہے تھے اور بیگو ایک باچھ میں حُقّے کی نال رکھے دُوسری باچھ سے مسکرا رہا تھا۔ ہادی کو یہ ماحول بڑا پیارا سا لگا۔ پچھلے چند دنوں سے اُس نے اپنے دل کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بیگو کے آنگن میں قدم رکھتے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اور اس کا دل کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر، جیسے بیری کی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ بیگو نے اسے دیکھا تو یوں ایک دم اُٹھا کہ حقّے کی ٹوپی اُپلے کی راکھ بکھیرتی ایک دائرے میں دُور تک لڑھکتی چلی گئی، اور پھر حقّے کے پاس واپس آ گئی۔ دینو اور شرفی رنگوں کی پیالیوں میں سرکنڈوں کے سرے ڈبو کر رہ گئے۔ ہادی کے قریب جا کر بیگو بولا۔

"نہیں تم ہادی نہیں ہو سکتے۔ تم ہادی ہوتے تو یہاں برسوں کے بعد نہ آتے۔ کل آتے جب دو گدھوں پر لدے ہوئے تمہارے کورے برتنوں کے دو بورے میری گلی میں سے بولتے ہوئے گزر گئے اور تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ بیگو کا گھر ہے یا اس

کی قبر ہے اور اگر تم ہادی ہی ہو تو بڑے ہی بے حیا آدمی ہو۔"

جب بگو نے بات ختم کی تو اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ ہادی اس سے بچوں کی طرح لپٹ گیا، تو اس نے ہادی کی پیٹھ پہ زور کا ایک دھوکا مار کر اسے سینے سے لگا لیا، اور پھر الگ ہو کر بولا۔

"تم ان لوگوں کو نہیں جانتے ہو گے۔ یہ میرا بیٹا ہے دینو، اور یہ میری بیٹی ہے شرفی —— اور بچو، یہ بھی تمہارا کوئی ہوتا سوتا ہے۔"

دینو نے بیری کے نیچے فوراً ایک کھاٹ بچھا دی، شرفی نے اس پہ کھیس بچھایا اور اس کے بعد دینو حقہ تازہ کرنے میں لگ گیا اور شرفی چولہے کے پاس جا بیٹھی، اور بگو ہادی کے بازوؤں کو ٹٹولنے لگا۔

"سچ سچ بتاؤ، تم ہادی ہو کہ کوئی بھوت ہو؟" وہ بولا "مجھے تمہارا کتنا انتظار تھا ہادی۔"

اور ہادی سوچنے لگا کہ آخر بگو کو اس کا کاہے کو انتظار تھا۔ انتظار تو بیٹی کے باپ کو ہوتا ہے۔ بیٹے کا باپ تو انتظار نہیں کرتا۔ بیٹے کے باپ کا تو انتظار کیا جاتا ہے، وہ تو انتظار کراتا ہے۔

"تمہیں کاہے کو انتظار تھا میرا؟" ہادی نے ہمت کر کے بگو سے پوچھ ہی لیا۔

اور بگو، دور کونے میں بیٹھی ہوئی شرفی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا "میں ایک بیٹی کا باپ ہوں ہادی۔"

ہادی کا دل، بیری کی شاخ پر سے جیسے پھڑپھڑا کر گرا، اور اس کی بھنچی ہوئی مٹھی میں گھس گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا "ٹھیک ہے، بگو کی بیٹی بھی تو ہے۔"

دینو نے حقہ لا کر ہادی کے سامنے رکھ دیا، اور بولا "بابا میں ذرا قصائیوں کے ہاں جاتا ہوں۔ شاید گوشت بنا ہو۔"

"ہاں ہاں!" بگو بولا "ضرور جاؤ۔ گوشت نہ ملے تو ولی کے ہاں سے ایک جوڑہ

بکرے لانا۔ کہنا اگلا آدھ اترنے پہ اکٹھے دس گھڑے پہنچا دوں گا۔ ہادی روز روز تو نہیں آئے گا یہاں۔"

دینو چلا گیا۔ شرفی جو چولہے میں پھونکیں مار مار کر آنکھوں اور چہرے کو لال کر چکی تھی اٹھی۔ دوپٹے کو بڑے قرینے سے لپیٹا اور گھڑا اٹھائے بیری کی طرف آنے لگی جس پر بہن بھائی نقش و نگار ابھارتے رہے تھے۔

"کہیں حفاظت سے رکھنا بیٹی۔" بگو نے کہا۔ "اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا، مکھیاں بیٹھ گئیں تو ناس مار دیں گی۔" پھر وہ ہادی سے مخاطب ہوا۔ "صوبیدار کے بیٹے کی شادی ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ صوبیدار نے کہا ہے۔ ایسی "گھڑولی" بناؤ کہ علاقے میں نام نکل جائے۔ دلہن کی سہیلیاں ویسے تو پنگھٹ پر، گھڑولی بھرنے جاتی ہیں نا، صوبیدار کہہ رہا تھا کہ وہ اس گھڑولی کو عرق گلاب سے بھروا دے گا۔ بہت کھاتا پیتا ہے، گاؤں کا سردار ہے۔ سو روپے پنشن ملتی ہے۔"

"تمہیں کیا ملے گا؟" ہادی نے پوچھا۔

"دوسرے ایک دیتے ہیں۔" بگو بولا "یہ پانچ دے گا۔ شاید زیادہ بھی دے دے۔ حوصلے والا آدمی ہے۔ مجھے تو ——" بگو رک گیا اور جب شرفی گھڑا اٹھا کر کوٹھے میں چلی گئی تو آہستہ سے بولا "مجھے تو آج کل ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ آخر ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔"

"ایک جوان بیٹے کے باپ بھی تو ہو۔" ہادی نے کہا اور فوراً پچھتانے لگا، کہ اس نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ دونوں باتوں میں آخر رشتہ کون سا تھا، اس نے گھبرا کر بگو کی طرف دیکھا، مگر بگو تو مسکرا رہا تھا، وہ بولا:۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس اسی سہارے تو زندہ ہوں، کہ ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں، تو میرا ایک جوان بیٹا بھی تو ہے۔ کوئی بیٹی کا پوچھنے آئے تو بیٹے کا رشتہ دے کے

جاتے۔ کسی نے بیٹے کی بات کی تو بیٹی کے رشتے کی شرط لگا دوں گا، ایک لے جاؤ ایک دے جاؤ۔ حساب برابر۔ پر کوئی پوچھتا بھی تو نہیں۔ دینو اٹھارہ سال کا ہے۔ شرفی ایک سال چھوٹی ہے۔ ان کے ہم عمروں کے ہاں دو دو تین تین بچے ہیں اور یہاں ان کی جوانیاں گلی جا رہی ہیں۔"

ہادی کو بگو نے جیسے کندھوں سے پکڑ کر چاک طرح گھما دیا، انہی چکروں میں، وہ بگو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے حیائی سے بولا "اور اگر میں کہوں کہ میں اپنی نازو کو تمہارے دینو کے حوالے کرتا ہوں؟"

"تو میں کہوں گا۔" بگو نے بھی اسی بے حیائی سے، بلکہ ذرا سا مسکرا کر کہا۔ "تو میں کہوں گا کہ میں اپنی شرفی کو تمہارے مراد کے حوالے کرتا ہوں۔"

"مراد؟" ہادی یوں چلایا، جیسے دونوں ویرانے میں بیٹھے ہیں، اور ان کے آس پاس میلوں تک کوئی آدم زاد موجود نہیں ہے، پھر اس نے چونک کر چولہے کے ساتھ ہلتی ہوئی شرفی کی طرف دیکھا اور بہت مدھم سرگوشی میں بولا۔

"مراد؟ ارے وہ تو ابھی ذرا سا لڑکا ہے۔ کل گیارہ بارہ سال تو اس کی عمر ہے۔"

"ہنڈیا ڈنڈیا تو بنا لیتا ہوگا؟" بگو نے جیسے ہادی کی اطلاع سنی ہی نہیں تھی۔

اور ہادی بولا۔ "ارے اس نے تو مٹی کو چھوا تک نہیں، وہ تو مسجد میں پہلا سیپارہ پڑھ رہا تھا، جب ملک عالم علی کا بیٹا اسے لاہور لے گیا۔ وہاں وہ لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہے، اور مراد اس کا نوکر ہے۔ سنا ہے اب تو پلاؤ تک بنا لیتا ہے۔"

"اچھا تو وہ لاہور میں ہے؟"

"ہاں پانچ سات سال کا تھا، جب تم نے دیکھا تھا۔ اب گیارہ بارہ کا ہوگا۔"

بگو نے ہنس کر کہا۔ "سدا گیارہ بارہ کا تو نہیں رہے گا۔ پانچ چھ سال میں دینو سے بھی قد نکال لے جائے گا۔ تمہارے باپ دادا تو چھ فٹے جوان تھے۔ تم بھی کسی سے

کم نہیں ہو، میرا سر تمہاری ٹھوڑی کو چھوتا ہے۔ بچوں کا کیا ہے کدو کی بیل کی طرح بڑھتے ہیں۔ صبح یہاں ہیں شام کو وہاں پہنچ رہے ہیں۔"

ہادی کو یہ بات مطمئن نہ کر سکی، آگے کھسک کر، بگو کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور بولا "شادی کی ایک عمر ہوتی ہے نا۔ مراد کی ابھی شادی کی عمر کہاں ہے؟"

"یوں بھی ہوتا ہے۔" بگو بولا۔ "کہ شادی کی عمر آئی، اور گزر گئی، اور نصیبہ ہی نہ جاگا۔"

ہادی نے ایک بار تو فیصلہ کر لیا کہ وہ بگو سے سچی بات کہہ دے مگر پھر محسوس کیا کہ بات کہتے ہوئے اس کی زبان چر جائے گی۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ میرے لئے تو اپنی پندرہ سال کی نازو ہی مصیبت بن گئی ہے۔ میں تمہاری سترہ برس کی شرفی پہ مراد کے جوان ہونے تک کہاں پہرے دیتا پھروں گا، اور جوانیاں جب آتی ہیں تو یونہی چپکے سے نہیں کھسک جاتیں۔ وہ تو پیروں کی طرح نذرانے مانگتی ہیں۔ اور ہم غریبوں کی بیٹیاں اگر نذرانے بانٹتی پھریں تو عمر بھر کوئی تھوکے بھی نہیں۔

"بھئی سچی بات ہے۔" آخر ہادی کو صرف یہ کہنے کی توفیق ہوئی۔ "مراد بہت چھوٹا ہے۔" پھر وہ اس ڈر کے مارے کہ کہیں بگو پہلے سے نہ بول دے۔ فوراً کہنے لگا۔ "دینو کے لئے میری نازو موجود ہے۔ شرفی کے لئے بر ڈھونڈنا میرا ذمہ رہا۔"

بگو حقے کو ایک طرف ہٹا کر، بڑی سنجیدگی سے اور نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو تم میری شرفی کے لئے بر کیوں ڈھونڈتے پھرو۔ اپنی نازو کے لئے کیوں نہ ڈھونڈو ———" پاؤں لٹکا کر اس نے جوتا پہنا اور بولا۔ "صرف اپنی بیٹی کا باپ بن کر مت سوچ۔ بیٹیاں دوسروں کی بھی ہوتی ہیں اور وہ انہیں بھی بڑی پیاری ہوتی ہیں۔" اور وہ حقے پر سے ٹوپی اتار کر چولہے کی طرف اس تیزی سے بڑھا جیسے فوراً نہ پہنچا تو آگ بجھ جائے گی۔

ہادی یوں سُکڑ کر رہ گیا جیسے بگو نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس کے سارے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے ہیں، اس کا جی چاہا کہ باپ بیٹی کی آنکھ بچا کر کھسک جائے اور گاؤں کی گلیوں میں سے سرپٹ بھاگتا ہوا اتنی دُور نکل جائے، جہاں اُسے مرتے دم تک بگو کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بگو کے سامنے وہ کتنا چھوٹا سا ہو کر رہ گیا تھا، بالکل چُوہا سا۔

"کش لگاؤ گے؟" بگو نے جیسے اس کے سر پہ گولا چھوڑ دیا۔ پھر وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا:۔

"گھبرا کیوں گئے ہو ہادی۔ میں جانتا ہوں، تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں، کہ تم آج برسوں کے بعد میرے پاس کیوں آنکلے ہو، اور یہ بھی بتا دوں، کہ تم نہ آتے تو خود میں چند دنوں میں تمہارے پاس آنکلتا۔"

ہادی کی ڈھارس بندھی۔ بگو کی طرف دیکھے بغیر، چند کش لگائے اور نال کو گھما کر بگو کو تھمانا چاہتا تھا، جب بگو نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

"سنو! یوں کیوں نہ کریں۔"

ہادی نے پوچھا "کیا؟"

بگو بولا "دینو، تمہارا داماد بن جائے اور تم میرے۔"

"میں!" ہادی ایک بار پھر چیخ اُٹھا، اُس نے تڑپ کر شرفی کی طرف دیکھا، جو سُرماہی میں چمچہ چلا رہی تھی۔ پھر آگے کھسک کر، وہ بگو کے گھٹنے پہ گھٹنا رکھتے ہوئے بولا "میں کیسے؟"

بگو نے اس کے بازو کو تھپتھپا کر کہا "کنپٹیوں پر بالوں کی ذرا سی سفیدی سے لوگ بوڑھے نہیں ہو جاتے، اور تم تو ابھی چالیس برس کے بھی نہیں ہوئے۔ مجھے تو تمہاری پیدائش تک یاد ہے، میں تو ان دِنوں اچھا خاصا سیانا تھا۔ میانوالی کے بازار میں

جا کر گھڑے اور صحنکیں بیچ آتا تھا۔"

"پر میں کیسے بھئی بگو؟" ہادی نے فریاد کی "دُنیا کیا کہے گی۔ دُنیا تو یہی کہے گی کہ اپنی شادی کی خاطر بیٹی کا سودا کر لیا۔"

بگو بولا "اور دُنیا اس وقت کیا کہے گی، جب تمہاری بیٹی کنواری بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی، اور پھر دُنیا کا کیا ہے۔ دُنیا کی زبان نے تو کئی نیک پاک پردہ داروں کو بھی معاف نہیں کیا۔ تمہاری میری بیٹیاں تو کمہارنیں ہیں۔ مٹی ڈھونے اور برتن بیچنے اور چھتیں لیپنے والیاں۔ ان پر تو لوگ جب چاہیں بدنامیوں کے ٹوکرے اُلٹ دیں۔"

ہادی نے رُکتے رُکتے کہا "سچ کہتے ہو۔ پر میں تو ——"

اُوپر سے دینو چیختا چلاتا ہوا، ایک چوزہ پکڑے آگیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

پھر جب دن ڈھلے ہادی نے واپس گاؤں جانا چاہا تو دینو نے شرفی کو پکارا۔

"ادھر آ شرفو۔ چاچا جا رہا ہے۔"

شرفو ذرا سی لڑکی کی طرح بھاگتی ہوئی آئی اور ہادی کے سامنے مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ مگر ہادی کے تیور دیکھ کر جیسے دینو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہادی نے گھبراہٹ میں دینو سے بھی ہاتھ نہ ملایا اور دونوں بھائی بہن چپ چاپ وہیں بیری کے نیچے کھڑے رہ گئے۔

گلی کے سرے پہ پہنچ کر، بگو نے ہادی کو بھینچ کر سینے سے لگایا، اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا "تو پھر وہ بات ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے" —— ہادی نے نہ جانے اس دوران میں کب فیصلہ کر لیا تھا، اور بگو نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔

نازو کی شادی کے بعد، ہادی گھر سے باہر ہوتا، تو لوگوں سے چھپتا پھرتا اور گھر آتا، تو

شرفی سے کتراتا رہتا۔ رات کو جب شرفی، برتن دھوکر فارغ ہوجاتی، اور کواڑ بند کرکے، اور دیا بجھاکر، اپنی چارپائی پر پڑ رہتی، تو ہادی کتنی دیر تک اندھیرے میں گھورتا رہتا، آنکھیں بند کرتے ہوئے، اسے ڈر لگتا۔ کیونکہ اس طرح اندھیرا چمکنے لگتا تھا اور چاروں طرف سے انار سے چھوٹنے لگتے تھے۔ وہ کئی بار آہستہ سے کواڑ کھول کر صحن میں نکل جاتا اور ماگھ اور پوس کی ٹھنڈی راتوں میں، دیر تک ادھر سے اُدھر گھومتا رہتا۔ اس دوران میں وہ شرفی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ کبھی وہ اسے رنگین "گھڑولی" پر چڑیوں کی تصویریں بناتی نظر آتی اور کبھی چولہے میں پھونکیں مارتے مارتے تھک کر اٹھتی، اور تپا ہوا چہرا اور دہکی ہوئی آنکھیں لئے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگتی اور ہادی کا جی چاہتا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی چادر کے پلو سے، اس کی بھیگی ہوئی سرخ آنکھیں پونچھ ڈالے، اور اس کے چہرے کو کتاب کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس سے کہے۔

"شرفی۔ اب کیا ہوگا۔"

اور ایک روز وہ یخ بستہ اندھیرے میں ٹہلتے ٹہلتے اچانک کوٹھے کی طرف بڑھا، آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر گیا۔ کواڑ بند کرکے، دیا سلائی اٹھائی اور دیا جلا دیا۔ پھر وہ پنجوں کے بل شرفی کے پاس آیا۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہی تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ، نیچے فرش تک پہنچ رہی تھی۔ ہادی نے لٹ کو، اس پھولوں کی طرح چھوا، جو ذرا سے مس سے پتی پتی ہوکر بکھر جاتا ہے۔ مگر شرفی کو جیسے اس مس نے بھی جھنجھوڑ ڈالا وہ تڑپ کر اُٹھی، اور ہادی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھر اس نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے، حواس باختہ، ہادی کو کھینچ کر چارپائی پر بٹھالیا اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بچے کی طرح سسکنے لگی، پھر اس نے ہادی کو ناقابلِ یقین قوت کے ساتھ، اپنی طرف کھینچ کر، اپنے گال اس کی دو روز کی بڑھی ہوئی داڑھی سے رگڑ ڈالے، اور اس کے کندھوں پر سر رکھ کر کچھ اس طرح مچل کر رونے لگی، جیسے ہادی نے اسے بروقت نہ روکا تو وہ آنسو بن کر بہہ جائے گی۔

کڑوے تیل کے دیئے کی میلی زرد روشنی میں بُت کی طرح بیٹھے ہوئے ہادی کو اس عجیب و غریب لمحے میں سوائے اس کے کوئی بات نہ سوجھی کہ وہ بھی رونے لگے، مگر وہ رویا نہیں۔ شرفی کو نرمی سے الگ کرکے اُٹھا۔ دیئے کے پاس جاکر تیلی سے اس کی لَو بلند کردی، اور پھر اُسے اٹھاکر شرفی کے پاس لے آیا۔ دیئے کو شرفی کے پاس لے جاکر، وہ پاگلوں کی طرح اُسے گھورنے لگا۔ شرفی، لمحے بھر کے لئے تو گھبرا کر رونا بھول گئی، اور صرف دو ایک سسکیوں نے اس کے چہرے کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ پھر اُس نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر چمٹے ہوئے بالوں کو ہٹایا، اور مسکرانے لگی۔ وہ اپنا چہرہ دیئے سے اتنا قریب لے آئی کہ اگر ہادی اسے فوراً نہ ہٹا لیتا، تو اس کی پلکیں جل جاتیں۔ دیئے کو زمین پر رکھ کر، ہادی اٹھا، اور اپنی چادر کے پلّو سے، شرفی کی آنکھیں، اور چہرہ پونچھنے لگا اور شرفی بچوں کی طرح ٹھوڑی اُٹھائے بیٹھی رہی۔ پھر ہادی نے اس کے بالوں کو کانوں کے پیچھے اٹکا کر، دیا اٹھایا، اور طاقچے پر رکھ دی پھونک ماردی، واپس آکر، اس نے شرفی کے سر کو اپنے کندھے پر رکھ دیا اور اس کے بالوں کے نیچے ہاتھ لے کر اس کی گردن کھجاتے ہوئے بولا "شرفی۔"

شرفی نے اس سے بھینچ کر کہا "اللہ کا شکر ہے، تم میرا نام تو جانتے ہو۔"

چھ سات سال کے عرصے میں ہادی نے اتنے گھڑے، صحنکیں، پیالے، ہانڈیاں اور سرپوش بنا ڈالے کہ اس کے ہم عمر کمہاروں نے اپنی ساری عمر میں بھی شاید ہی بنائے ہوں۔ مٹی کو بھگوتی اور اُسے آٹے کی طرح گوندھتی ہوئی شرفی، ہولے ہولے گیت گنگناتی اور مٹی کو چاک پہ رکھ کر، ہادی اس گیت کے تال پہ برتن بناتا اور جب یہ برتن آوے سے پک کر آتے اور ہادی ایک لکڑی یا انگشتِ شہادت کے جوڑ سے، سب برتنوں کو ایک ایک کرکے بجاتا، تو وہ کانسی کے کٹوروں کی طرح گنگناتے اور ہادی کہتا۔

"شرفی اپنی آواز سُن رہی ہو؟"

شرفی اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھتی۔ پھر اگر ہادی کسی ٹوٹے ہوئے برتن کو بجا بیٹھتا، تو شرفی تڑپ کر کہتی "ہادی۔ اپنی آواز سُن رہے ہو؟" دونوں زور زور سے ہنستے اور پڑوسی ان کی ہنسی کی آواز سُن کر کہتے، کہ شرفی کا سِن شادی کے روز جہاں تھا وہیں رُک گیا ہے اور ہادی پھر سے جوان ہو رہا ہے۔ شرفی کنوئیں سے پانی بھر کر لاتی تو عورتوں کی یہی باتیں ہادی کو سُناتی، اور ہادی کہتا "شرع میں کیا شرم ہے شرفی۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ میں جوان نہیں ہو رہا تو کیا بوڑھا ہو رہا ہوں؟ چھ سات سال ہو گئے۔ کبھی سر میں درد تک نہیں ہوا کہ بڑھاپے کی شکایت لے بیٹھوں۔ کھانسنا تک بھول گیا ہوں۔"

اس عرصے میں، شرفی کے ایک بیٹا ہوا، مگر دو دن بعد مر گیا، اور شرفی رو دھو کر اپنے دوا دارو میں مصروف ہو گئی، پھر بیگو نمونیہ کا شکار ہو گیا۔ شرفی نے میکے جا کر چند روز بین کئے، اور واپس آ کر اپنے کاموں میں لگ گئی۔ دینو، نازو کو لے کر مزدوری کرنے لائل پور کی طرف نکل گیا اور کچھ عرصے کے بعد، وہاں سے خط لکھا، کہ ہم نے یہیں جھونپڑی ڈال لی ہے۔ گاؤں میں آ کر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اُٹھ رہا ہے۔ ہم خود چینی کے پیالوں میں چائے پیتے ہیں۔

دو تین بار، مراد بھی چھٹی پر آیا۔ ایسے ٹھاٹھ تھے جیسے بی اے پاس کر آیا ہے۔ اپنے علاقے کی زبان تک بھول گیا تھا۔ "جاداں گے۔ لیاداں گے" بولتا تھا۔ بالوں میں ایسے تیل ڈالتا تھا کہ جہاں سے گزرتا تھا، گزوں تک لوگ لمبی لمبی سانسیں لیتے رہ جاتے۔ جب وہ آخری بار آیا تو اس نے داڑھی مونچھیں صاف کر رکھی تھیں، اور ایک چمکتی ہوئی پائپ میں بگلے کا سگریٹ رکھ کر پیتا تھا۔ اور قد، یوں ایک دم بڑھ گیا تھا جیسے کسی نے اسے سر اور پاؤں سے پکڑ کر کھینچ دیا ہے۔ وہ ہادی اور شرفی کے لئے قسم قسم کی چیزیں

لے آیا۔ بسکٹ اور رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور سنہری کنگھے، اور طباق طباق بھر کے آئینے، مگر جب واپس گیا، تو اپنے پیچھے بہت تیز خوشبو چھوڑ گیا، اور خوشبو یہ تھی کہ کمہار ہو کر عشق کرتا ہے اور اس نے غضب یہ ڈھایا ہے کہ ایک دھوبن کو لیٹھے کا تہمد اور عطر کی دو شیشیاں دے گیا ہے اور دھوبن کی ماں نے یہ تینوں چیزیں پکڑ لی ہیں اور اپنے صندوق میں رکھ لی ہیں۔

یہ خبر جب ہادی تک پہنچی تو اس کی صُورت کچھ ایسی نکل آئی، جیسے اس کی زندگی کے چھ سات برس، بس ایک پل میں گزر گئے۔ اور وہ اچانک بوڑھا ہو گیا ہے۔ شرفی بھی دن بھر کھوئی کھوئی سی رہی۔ رات دیر تک، میاں بیوی بیٹھے مشورے کرتے رہے اور آخر فیصلہ کیا کہ مراد کے لئے جلدی سے کوئی رشتہ ڈھونڈا جائے اور لاہور سے بُلا کر اس کا بیاہ کر دیا جائے۔

ابھی دونوں رشتے کا سراغ لگانے میں مصروف تھے، جب ایک شام کو مُراد سر پہ بکس اور بستر رکھے گھر آ گیا۔ ہادی نے وجہ پوچھی، تو معلوم ہوا کہ ملک عالم علی کے بیٹے نے جواب دے دیا ہے۔ کہا ہے تم بہت بڑے ہو گئے ہو اور مجھے تو چھوٹی عمر کا نوکر چاہیئے۔

تین چار دنوں کے بعد، ملک عالم علی نے ہادی کو اپنے ہاں بُلایا اور اسے اپنے بیٹے کا خط پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا کہ مُراد نے یہاں میری برسوں کی عزت پر پانی پھیر دیا ہے۔ اُس نے پڑوس کی ایک نوکرانی کے ہاتھ پر اپنی ساری تنخواہ رکھ دی، اور رات کو اُسے اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ وہ تو اتفاق ہو گیا کہ مجھے اسی وقت کسی ضرورت سے اس کی کوٹھڑی میں جانا پڑا۔ نوکرانی کو میں نے دھکے مار کر نکال دیا اور مراد کو کرایہ دے کر اسی لمحے گاڑی میں بٹھا دیا۔ مگر پڑوس کے نوکروں کو سارا قصّہ معلوم ہو گیا اور دوسرے دن بات میرے دفتر تک پہنچ گئی۔ آپ ہادی سے کہئے کہ اپنے بیٹے کو باندھ کر رکھے۔ مکھن توس کھاتے کھاتے اس کا ہاضمہ بگڑ گیا ہے۔

ہادی واپس گھر آکر شرفی کو کوٹھے میں لے گیا، اور اسے سارا قصّہ سنایا۔ شرفی کچھ دیر تک ٹھوڑی کو مٹھی میں لئے سوچتی رہی پھر بولی۔

"جلدی سے اس کی شادی کا بندوبست کرو ورنہ ہمیں بھی لائلپور، ملتان کی راہ لینی پڑے گی۔ تم بھی کوشش کرو۔ مَیں بھی کرتی ہوں۔ تین سو روپیہ جو جمع کر رکھا ہے اسے چادر کے پلّو میں باندھو اور لڑکی کی تلاش میں جہاں تک جا سکتے ہو جاؤ۔ مُراد، اگر لاٹ کے شہر میں ایسا کر سکتا ہے تو صوبیدار کے گاؤں میں تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے گا۔ بیٹا بیٹی، بہت پیاری چیزیں ہوتی ہیں۔ مگر جوان ہو جائیں تو یوں سمجھو کہ تمہارے صحن میں سونے کی ایک ڈلی پڑی رہ گئی ہے، اور تم گھر سے کوسوں دُور چلے گئے ہو۔ جس کی آنکھ پڑے گی، اٹھا لے گا۔"

ہادی ایک ثانیے کے لئے حیران ہوا کہ شرفی اتنی بہت سی دانائیاں کہاں سے جمع کرتی رہی ہے۔ مگر اس وقت گنگناتا ہوا مراد حقّے کی ٹوپی ہاتھ میں لئے چولھے کی طرف جاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گذر گیا۔ اور ہادی سنبھل بیٹھا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے کہا۔ "بہت ٹھیک کہتی ہو۔"

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ چادر اٹھا کر کندھے پر رکھی اور صحن میں آگیا۔ مراد کو اپنے پاس بُلایا، اور پرلی طرف دیوار کے سائے میں لے جا کر اسے ملک عالم علی کے بیٹے کے خط کا سارا مضمون سُنا دیا۔

"بکتا ہے۔" مراد بولا۔ "خود جو کچھ کرتا پھر رہا ہے، وہ میں بتا دوں تو عالم علی کو دُنیا کی نظروں سے چھپنے کے لئے کنوئیں میں کُود جانا پڑے اور خود عالم علی کہاں کا فرشتہ ہے۔ اُس کے بیٹے نے مجھے اُس کے سارے کرتوتوں کے قصّے سنائے ہیں۔"

"تم کمہار ہو۔" بیٹے کو ڈانٹنے کے لئے ہادی کو صرف یہی الفاظ سُوجھ سکے۔

مراد فوراً بولا۔ "کمہار کا بیٹا ہُوں اس لئے کمہار نہیں کہلاؤں گا، تو کیا ملک

کہلاؤں گا۔"

ہادی پر ایک دم پانی پڑ گیا جیسے سب کیا دھرا اسی کا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "قصور میرا ہی ہے اور یہ بھی میرا ہی قصور ہے کہ تمہیں لاہور بھیج دیا۔ تمہیں شہروں کی ہَوا لگنے دی، اور تمہیں اتنا بھی نہ بتا سکا کہ کمہاروں کی بھی عزّت ہوتی ہے، اور اس عزّت کی حفاظت کمہار ہی کرتے ہیں۔"

"تو ابّا۔" مراد اس کے بالکل قریب آکر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ جب تم اس بڑھاپے میں ایک جوان لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اپنی جوان بیٹی کا سودا کر رہے تھے تو اس وقت کمہاروں کی عزّت ——"

ہادی نے مُراد کے منہ پر اس زور کا تھپّڑ مار دیا، کہ منڈیر پر سے چڑیاں اُڑ گئیں، اور دہلیز پر بیٹھی ہوئی شرفی، گیند کی طرح اُچھل گئی۔ مُراد ہکّا بکّا کھڑا رہا۔ پھر ہادی نے، زار زار روتے ہوئے، چادر کا ایک پلّو منہ میں ٹھونس لیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ شرفی اس کی طرف بھاگی۔ مُراد بھی پلٹا اور شرفی سے پہلے ہی اپنے بازو سے ہادی کو لپیٹ لیا۔

"نہیں ابّا۔" وہ بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے پاؤں چُھوتا ہوں۔ اُس نے جھوٹا خط لکھا، اس لئے مجھے غصّہ آگیا۔"

شرفی، ایک طرف کھڑی، ہادی اور مُراد کی طرف دیکھتی رہی اور جب ہادی نے آنسو پونچھ کر اس کی طرف پٹے ہوئے بچّے کی طرح دیکھا، تو یوں دیکھتا رہ گیا، جیسے پوچھ رہا ہے، "تو کیا تم نے ساری باتیں سُن لی ہیں؟" —— مگر شرفی، سینے پر بازوؤں کی قینچی بنائے کھڑی رہی، اور جب مراد وہاں سے اُٹھ کر ایک طرف جانے لگا تو اس نے ہادی کا بازو پکڑ کر اسے اُٹھایا، اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑی اور آہستہ سے بولی۔

"جاؤ۔ جیسا میں نے کہا تھا ویسا کرو۔ میں بھی جاتی ہوں۔ کھانا اچار سے کھائیں گے۔"

ہادی نے آس پاس کے دیہات کے کتنے چکر لگا ڈالے اور شرفی نے اپنے گاؤں میں کمہاروں کا ایک ایک گھر چھان مارا، مگر قریب قریب سب کمہار بیٹیوں کے ساتھ بیٹے لئے بیٹھے تھے۔ جو فوراً "جوابی رشتہ" طلب کرتے تھے اور ہادی اور شرفی، مایوس ہوکر اُٹھ آتے تھے۔ اگر کسی کے ہاں صرف لڑکی تھی تو وہ بارہ سو سے نیچے بات ہی نہیں کرتا تھا، اور یہاں کل اثاثہ ہی تین سو تھا۔

اس دوران میں یہ غضب بھی ہو گیا کہ ایک روز مُراد نوری دھوبن سے باتیں کرتا ہوا پکڑا گیا، نوری کے بھائیوں نے اس کا پیچھا کیا، اور اگر سب کمہار مراد کی مدد کو نہ آ نکلتے، تو دھوبی مُراد کے گھر میں گھس کر اس کی دھجیاں اڑا دیتے۔ اس روز صوبیدار نے ہادی کو بُلا کر کہا، کہ اگر آج کے بعد مُراد نے کوئی ایسی حرکت کی، تو اس سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔

"اپنے اس پلے ہوئے سانڈ کی فوراً کہیں شادی لگا دو" صوبیدار نے کہا۔ "ورنہ یہ قتل ہوگا یا جیل جائے گا۔"

واپس آتے ہوئے ہادی نے اگرچہ اِدھر اُدھر نہ دیکھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ سب لوگ، اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں بلکہ بچوں کے انبوہ دروازوں پر جمع ہیں، اور عورتیں اسے دیکھنے کے لئے چھتوں پر سے لٹکی پڑ رہی ہیں۔ گھر میں داخل ہوا تو وہ ٹھنڈا برف ہو رہا تھا۔ اس نے مراد سے کوئی بات نہ کی۔ شرفی کے سامنے رو دیا۔ اور وہ اس کا ساتھ دیتی رہی۔ پھر دونوں آنسو پونچھ کر اُٹھے اور اکٹھے نادر کمہار کے ہاں چل دیئے، جس نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار تو کیا تھا مگر یہ انکار اتنا سخت نہیں تھا کہ ہادی اور شرفی کو اس کے پاس دوبارہ جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ دونوں کی آنکھیں سُرخ اور سُوجی ہوئی تھیں اور گلیوں میں آگے پیچھے یوں چپ چاپ سر جھکاتے چلے جا رہے تھے،

کہ سارا گاؤں ان کا مقصد بھانپ گیا۔

جب میاں بیوی نادر کمہار کے آنگن میں داخل ہوتے تو وہ چاک سے اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھا سستا رہا تھا۔ جاتے ہی شرفی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور ہادی نے اپنی پگڑی اس کے قدموں پر ڈال دی اور پھر دونوں بیٹھ کر رونے اور آنسو پونچھنے لگے۔

نادر، اپنے پاؤں چھڑا کر اور پگڑی ہادی کے سر پر رکھ کر اُٹھا، اور اندر سے ایک پیڑھی لا کر شرفی کے پاس رکھ دی۔ ہادی کو اُس نے چارپائی پر اپنے پاس بٹھا لیا، اور بولا "میں نے سب سُن لیا ہے۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی شادی کر دو۔ میں جانتا ہوں تم اسی لئے میرے پاس آئے۔ مگر بھیّا! بات یہ ہے کہ مجھے بھی تو اس دُنیا میں زندہ رہنا ہے۔ بیٹی اگر تمہارے پاس چلی گئی، تو میں اکیلے کیا کروں گا، کیسے جیوں گا۔ تم یوں کرو۔ کہیں سے کسی بیوہ کا انتظام کر دو۔ میں اسے اپنے گھر میں ڈال لوں گا۔ تم میری بیٹی کو اپنے ہاں لے جانا۔ گندی بات ہے پر سچّی بات ہے۔ تم دونوں جب کوئی انتظام کر لو گے تو میں بیٹی کا ہاتھ پکڑوں گا اور تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ لڑکا بدنام ہے پر بدنامیاں تو درخت کے پتوں کی گرد ہیں؛ ایک چھینٹا پڑا اور غائب۔ پیر دستگیر کی قسم لے لو۔ ہاتھ ملا لو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا اور ہادی نے آہستہ سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وعدہ کرکے دونوں گھر واپس آکر کوٹھے کے اندر چلے گئے، اور ایک اندھیرے گوشے میں جا کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"ڈھونڈ لیں گے" شرفی بولی۔ "ایسی بھی کیا بات ہے۔ کئی ضرورت مند بیچاریاں بیٹھی ہوں گی۔"

"آؤ ایک نظر دوڑا لیں۔" ہادی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے گاؤں اور قریب کے دوسرے دیہات میں انہیں چار بیواؤں کے نام سوجھے، دوسرے روز دونوں، پہلے اپنے گاؤں اور پھر دوسرے دیہات میں گئے

اور شام کو تھکے ہارے واپس آتے۔ لڑکیوں والے تو صرف انکار ہی کرتے تھے، بیواؤں کے وارثوں نے تو انہیں دھتکار دیا تھا ——— اور مُراد صحن کے ایک کونے میں چارپائی پر بیٹھا مسلسل حقّہ پیئے جا رہا تھا۔

دو تین روز تک ہادی اور شرفی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور حیران ہوتے رہے۔ تیسرے روز ہادی کو ایک بیوہ کمہارن یاد آئی، جو سات آٹھ کوس دُور کے ایک گاؤں میں رہتی تھی اور اس کا باپ ہادی کے لئے کچھ ایسا اجنبی نہ تھا۔ شرفی سے مشورہ کر کے وہ صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اندھیری شام کو تھکا ماندہ، ٹوٹا ہارا، ہادی اپنے گاؤں میں داخل ہوا۔ دھوبیوں کی گلی کو طے کر کے جب وہ دوسری گلی میں مُڑا، تو پرلی طرف دیوار کے ساتھ چمٹے ہوئے اسے دو سائے نظر آئے۔ وہ رُک گیا اور یوں گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے سارا گاؤں چھتوں پر چڑھ آیا ہے اور اسے چیتے کی سی چمکتی ہوئی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔

اچانک نہ جانے اسے کیا سُوجھی کہ وہ پکارا "مراد"

سائے دیوار سے اُچٹ آئے۔

"گھر چلو۔" وہ چیخا۔

ایک سایہ گلی میں تیزی سے جانے لگا۔ ہادی نے اس کا پیچھا کیا، اور جب دونوں اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو ہادی نے مُراد کو ہاتھ سے پکڑ کر کچھ عجیب سی، گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا "اب آرام سے اپنے گھر میں بیٹھو۔ میں کل ہی تمہارا بندوبست کئے دیتا ہوں۔"

شرفی تیر کی سی تیزی سے ہادی کے پاس آ گئی "ہو گیا کام؟" اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ پھر چونک کر بولی "ہائے۔ تم کیسے ٹھنڈے برف ہو رہے ہو۔"

ہادی خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں؟" شرفی نے ہادی کو ہاتھ سے جھنجھوڑا "کیا ہوا؟" وہ پکاری۔

"شرفی!" وہ جیسے نیند میں بڑبڑایا۔

"ہاں کہو۔" شرفی بولی۔

"شرفی۔" وہ پھر اسی طرح بڑبڑایا "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" پھر وہ پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح گرجا "طلاق طلاق۔ طلاق۔"

تڑاخ سے زمین پر گرتی ہوئی شرفی سے بے خبر، وہ صحن سے باہر لپکا۔

نادر کے کواڑ ایک دھماکے سے کھُلے، اور ہادی نے دیوار کے سوراخ میں رکھے ہوئے دیئے کی روشنی میں، نادر کو پہچان کر اسی کھوکھلی آواز میں کہا "تم نے پیر دستگیر کی قسم کھائی تھی؟"

"ہاں کھائی تھی؟" نادر حیران ہو کر بولا۔

"تو لڑکی کو میرے گھر چھوڑ آؤ۔" ہادی بولا۔

قریب کی چارپائی پر لیٹی ہوئی لڑکی، شپ سے اندر بھاگ گئی۔

"کیوں؟" نادر نے پوچھا "کام ہو گیا کیا؟"

"ہاں ہو گیا۔" ہادی بولا۔

"کہاں؟" اُس نے پوچھا۔

اور ہادی ٹوٹے ہوئے برتن کی سی آواز میں بولا "میں بیوی کو طلاق دے آیا ہوں۔"

ماتم

آسمان پر کفن سا سفید بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی سی بُو بسی ہوئی تھی۔ میاں جی کا جنازہ ابھی ابھی اُٹھا تھا مگر جنازہ اُٹھنے پر گھروں میں جو قیامت بپا ہوجاتی ہے اس سے میاں جی کی چار دیواری محروم رہ گئی تھی۔ کھلے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتیں ایک دوسرے میں کچھ یوں پیوست ہو کر بیٹھی تھیں کہ اگر ایک اُٹھتی تو سب کی سب اٹھی چلی جاتیں مگر سب شدید حد تک خاموش تھیں۔ خاموشی اور شدید خاموشی کے درمیان سکوت سے سناٹے کا فاصلہ ہے اور موت والے اس گھر کے آنگن پر یہی مہیب سناٹا مسلط تھا۔ بچوں تک نے دم سادھ لیا تھا، منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا بھی جیسے لاؤڈ سپیکر پر کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"تیر۔ تیر۔ تیر" یکایک ایک عورت کوے کی طرف بازو اُٹھا کر پکاری۔ کوا اُڑ گیا اور وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "ماتم کے گھروں میں بھی ہڈیاں ڈھونڈنے آ نکلتے ہیں۔ مُوئے کلموہے زمانے بھر کے" پھر ایک لمبی "ہاہ" کے ساتھ اس نے اپنا بازو سمیٹ لیا۔

مجمع کو شاید اسی بات کا انتظار تھا کہ کوئی بولے تو ہم بھی بولیں اس لئے سب بولنے لگیں اور سب نے جیسے ایک ساتھ پہلو بدلے۔

"ہا، بے چاری بی بی!" کسی نے کہا۔

آنگن کے پرلے گوشے سے ایک بڑھیا نے پوچھا "بی بی روئی کہ نہیں؟"

"نہیں!" کوٹھے کے دروازے کے پاس سے جواب آیا "ویسے ہی بیٹھی ٹکٹکر دیکھے جا رہی ہے۔"

وہی بڑھیا بولی "اسے رُلانے کی تدبیر کرو کم بختو، ورنہ اس کا کلیجہ ٹھٹھے کی طرح بھرے پھٹ جائے گا۔ یہ سکتے کی بیماری ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور جان ہُوا ہو جاتی ہے۔ فوراں اپنے بیٹے کے مرنے پر یوں ہی مر گئی تھی۔"

سب کی نظریں بی بی پر جم گئیں جس نے اپنے میاں کے مرنے پر اب تک ایک آنسو بھی نہیں ٹپکایا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھی لیتی تھی، ہوں ہاں سے باتوں کا جواب بھی دے دیتی تھی مگر روتی نہیں تھی۔

"رو بی بی جی کھول کے رو" پہلی طرف سے ادھیڑ عمر کی بھاگاں اپنے آپ کو کھینچ کر اُٹھی اور عورتوں کو الانگتی اور بین کرتی ہوئی دروازے کی طرف یوں بڑھی جیسے بی بی کو رُلا کر ہی دم لے گی۔ علاقے بھر میں اس سے بہتر بین کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ انگشتِ شہادت کو آسمان کی طرف اُٹھا کر، اسے ماتمی دائروں میں گھماتے ہوئے بولی۔

"تیرے سر کے پھول کو آج موت کا بگولا اڑا لے گیا بی بی بہن! تیرے دنوں پر اب سورج کبھی نہیں چمکے گا، میری لٹی پٹی سہیلی! اتنے ڈراؤنے اندھیرے میں تو فرشتے بھی رو دیں بی بی! اور تو ہے کہ ایک چیخ بھی نہیں مارتی۔ میاں جی کا جنازہ اُٹھ گیا تو اب اپنی میت پر ہی رو لے۔"

"میں مر جو گئی ہوں بھاگاں!" بی بی نے آہستہ سے کہا اور یہاں سے وہاں تک عورتیں یوں کڑک کر رو دیں کہ ان کی گودوں میں دبکے ہوتے بچے بھی بلبلا اُٹھے،

جن کے کانوں میں بی بی کی آواز نہ پہنچ سکی۔ وہ اپنے اُس پاس سے رونے کی وجہ پوچھ کر رو دیں حتیٰ کہ یہ ماتمی لہر آنگن کے پرلے سرے تک پھیل گئی۔ وہ بچے جو جنازے کے پیچھے نکل گئے تھے۔ ماتم کی گونج سن کر بھاگتے ہوئے آئے اور آنگن میں جھانکنے لگے۔ جو بچے سناٹے سے سہم کر ماؤں کے پاس ٹھنسے ہوئے بیٹھے تھے اُٹھے اور کوٹھے کے دروازے سے لگ کر بی بی کو گھورنے لگے۔

بی بی کا چہرہ فق تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خالی پن تھا جیسے ان میں سے کوئی کچھ نکال کر لے گیا ہے۔ اس کے ہونٹ مٹی ہو رہے تھے۔ اور اس کی کلائی کے ایک زخم پر ایک مکھی بار بار آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب حافظ جی نے یکایک بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو کوٹھے کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی بی بی نے اپنی ناک کی کیل نوچ کر پھینک دی تھی اور چھنن چھنن سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور جب اِدھر میاں جی کا ٹاٹھا بند ھ رہا تھا تو اُدھر عورتیں سوئی کی مدد سے بی بی کی کلائی میں سے کانچ کا ایک ٹکڑا نکال رہی تھیں۔

بی بی کو پچاس برس کی عمر میں بھی چوڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ برس کی عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلائی پر ویسے بھی ہر رنگ کی چوڑی سج جاتی ہے مگر میاں جی تو چوڑیوں کے انتخاب میں فن کار تھے۔ ایسے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے تھے کہ آج تک وہ رنگ نہ کسی نے دیکھے تھے نہ سُنے تھے، ایک بار تو انہوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے تمہارے سارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔

میاں جی کو قسم قسم کی پلیٹیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسی لئے گول، چوکور، تکونی اور کناروں والی پلیٹوں کا انبار ان کے ہاں جمع ہو گیا تھا اور وہ پلیٹ تو انہیں بہت عزیز تھی جو وہ پونا سے لائے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں جمعدار کلرک تھے۔

کوئی چینی پھیری والا پلیٹیں بیچتا پھرتا تھا۔ اس پلیٹ کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی جو انگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میاں جی کہتے تھے کہ جب انہوں نے یہ تصویر دیکھی تو ان کے سامنے بی بی کی صورت گھوم گئی۔ سو انہوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پلیٹ خرید لی تھی اور جب چھٹی پر آئے تھے تو بکس میں سے یہ پلیٹ نکال کر بی بی سے کہا تھا: "جس طرح کہانیوں کے جنوں بھوتوں کی جان طوطی میں ہوتی ہے اسی طرح اس جن کی جان اس پلیٹ میں ہے اس لئے کہ پلیٹ میں تم ہو۔"

بی بی نے یہ پلیٹ برسوں تک اپنے کلیجے سے لگا رکھی تھی۔ دَم توڑنے سے ذرا پہلے میاں جی نے فرمائش کی تھی کہ دوا المسک اسی پلیٹ میں رکھ کر کھلائی جائے اب بھی وہ پلیٹ کوٹھے کے اندر ایک الماری پر رکھی تھی اور بی بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی تھی جیسے ابھی بچوں کی طرح بسک بسک کر رونے لگے گی مگر نہ جانے یکایک عین موقعے پر اسے رونا کیوں بھول گیا تھا۔

رونا تو اس کا ایک ہتھیار تھا۔ وہ تو میاں جی کی ایسی باتوں پر بھی رو دی تھی کہ آج کے سالن میں کل والا مزا نہیں ہے، اور اُسے روتا دیکھ کر میاں جی کو صدق دل سے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ مغلوں کے شاہی باورچیوں کو بھی اس مزے کا سالن تیار کرنے کا نسخہ معلوم نہ تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے دونوں خود ہی کبھی کبھی بچے بن جاتے تھے خوب خوب روٹھتے اور روتے تھے۔

"تم مجھ سے ویسا پیار نہیں کرتیں جیسا میں کرتا ہوں۔" میاں جی کہتے اور بی بی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے باوجود مچل جاتی کہ میاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے۔

اور آج میاں جی اس گھر میں سے ہمیشہ کے لئے اُٹھ گئے تھے۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر واپس آنے والے میاں جی کے قدموں کی چاپ کبھی نہیں سُن سکے گی۔

اب کبھی یوں نہیں ہوگا کہ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلے تو اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہو اور میاں جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر اپنی ایک انگلی کی پور پھیر رہے ہوں۔ اب کچھ بھی تو نہیں ہوگا۔ بی بی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سوچوں پر بھی تو رونا نہیں آرہا تھا۔

اگر اس کے آنسوؤں کا سوتا یکایک خشک ہوگیا تھا تو جب بھی کم از کم دنیا داری کے لئے تو اس کا رونا ضروری تھا۔ میاں جی کی دُور نزدیک کی رشتہ داریں جہاں جہاں روتی ہوئی آئیں اور بی بی کو گلے سے لگا کر ایسے ایسے بین کئے کہ دشمنوں کے کلیجے بھی پگھل جائیں مگر جب وہ بی بی سے الگ ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑتی دیکھی تو بعض حیران رہ گئیں، بعضوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور بعضوں نے چپکے سے دوسری کے کان میں کہا "دُنیا میں یہ پہلی بیوی ہے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوئی ہے۔" پھر یہ سرگوشیاں صحن میں دور نزدیک پھیل گئیں۔ یہاں سے وہاں تک عورتیں رونے کے بجائے ناکوں اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ دروازے سے لگ کر کھڑے ہوئے بچے بھی بی بی سے مایوس ہوکر اندر کوٹھے میں کھیلنے لگے اور وہ اس ہجوم میں اکیلی رہ گئی۔ رونا کوشش سے نہیں آتا۔ یہ تو محبت کی طرح بڑی بے ساختہ چیز ہے۔ مگر بی بی رونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے تیس برسوں کا ایک ایک واقعہ یاد کر ڈالا۔ کئی بار اس نے محسوس کیا کہ برسات کی رات ہے، چھت پر بوندیں بج رہی ہیں، بادل کہیں دُور جیسے نیند میں گرج رہا ہے۔ کوٹھے میں میلی میلی روشنی والا دیا جل رہا ہے، میاں جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ہے اور اس کے ہونٹوں کو میاں جی کے سینے کے بال چھو رہے ہیں۔ ان یادوں نے اسے جیسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھٹکا ڈالا مگر اس کی آنکھوں میں اسی طرح ریت کھٹکتی رہی۔

کئی بار بی بی نے اس جگہ کو گھورا جہاں میاں جی کی میّت جنازہ اٹھنے تک پڑی

رہی تھی۔ وہ ان پر پچھاڑیں کھا کھا کر گری تھی مگر لوگ پچھاڑوں کو نہیں دیکھتے آنسوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو بعض حیوان بھی پچھاڑیں کھا کر گر جاتے ہیں۔ انسان کی پہچان تو آنسو ہیں۔ انسان روتے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اُس کا دل دکھا ہوا ہے۔

آنگن کے ایک ایک چپّے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعے چمٹے ہوئے تھے۔ ان دیواروں اور ان منڈیروں پر آج کتنی کہانیاں اُتر آئی تھیں۔ بی بی نے رونے کی خاطر ایک ایک چیز کو گھورا۔ اس کی نظریں منڈیروں، دیواروں اور دروازے پر سے گھومتی ہوئی کوٹھے کے اندر داخل ہوگئیں۔

یکایک وہ تڑپ کر اُٹھی۔ دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا اور پھر ایک بلند چیخ کے ساتھ سینے پر نہایت زور کا دوہتڑ مار کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔

بھاگاں اُٹھ کر اس کی طرف لپکی اور پھر آنگن کے پرلے سرے تک تمام عورتیں اُٹھ چلی گئیں ——— "کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا اور پھر بھاگاں نے جیسے ایک مژدہ سناتے ہوئے کہا: "بی بی رو رہی ہے۔"

چند عورتوں نے لپکتی اور سسکتی ہوئی بی بی کا بھیگا ہوا چہرہ اُٹھا کر دوسری عورتوں کو دکھایا اور سب جیسے حیران ہو کر بولیں۔ "یہ تو زار زار رو رہی ہے بیچاری۔"

پھر اندر کوٹھے میں کسی عورت نے ایک بچے کے زور کا چانٹا مارا اور اسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی دہلیز پر آکر پکاری "نامراد نے بی بی کی پلیٹ کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔"

کھمبا

ایک رات زور کی آندھی آئی تو سارے محلّے کی بجلی اڑ گئی اور جب چند گھنٹوں کے بعد چلی تو جب بھی ہماری گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے بجلی کے کھمبے کے نصیب نہ جاگے۔ اس کا بلب ہمیشہ کے لئے بجھ چکا تھا۔ گلی کے بزرگ راجہ آصف علی نے پیش گوئی کی کہ اب کارپوریشن کے آئندہ انتخابات تک یہ گلی اندھیرے کے سپرد ہو چکی ہے۔ ہم نے اپنے اثر و رسوخ کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجہ صاحب کو اطلاع دی۔

"قبلہ! آپ آئندہ انتخابات کی حد قائم کر رہے ہیں اور اگر کل ہی نیا بلب لگ جائے تو؟"

اور راجہ صاحب بڑے اعتماد سے بولے۔

"تو کل قیامت آجائے گی۔" اس پر سب لوگوں نے قہقہے لگائے اور ایکدوسرے کے کندھوں پر ہاتھ مارنے کی کوشش میں اندھیرے کی وجہ سے ایک دوسرے کے منہ پر ہاتھ مارنے لگے۔ مگر ہم نے دوسرے ہی روز سے نئے بلب کے لئے کوشش شروع کر دی اور ہماری یہ کوشش کوئی چھ مہینے تک جاری رہی۔ ہماری گلی بدستور تاریک تھی مگر اب گلی والے اس تاریکی کے عادی ہو گئے تھے اور ایک روز راجہ آصف علی ہم سے کہہ رہے تھے۔

"اب تو آپ نئے بلب کی جدوجہد کو ختم ہی کر ڈالئے کیونکہ اگر خدانخواستہ کارپوریشن نے سچ مچ بلب لگا دیا تو جتنے دن ہم نے اندھیرے سے مانوس ہونے میں صرف کئے ہیں اتنے ہی روشنی سے مانوس ہونے میں اٹھ جائیں گے۔"

ویسے اب ہماری گلی میں اندھیرے کی ایک طرح سے تلافی ہو چکی ہے۔ کھمبے کے ساتھ بلب تو خیر پرانا ہی لٹک رہا ہے مگر اندھیرے کے ساتھ وہ جو اداسی خاموشی اور ویرانی شامل ہوتی ہے اس کا ہماری گلی میں دُور دُور تک پتہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری گلی میں شیخ جی آ گئے ہیں۔

بلب کے بجھنے کے بعد گلی والوں کا معمول ہو گیا تھا کہ ادھر شام ذرا سی گہری ہوتی اور ادھر سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ دو ایک گھروں میں ریڈیو تھے تو وہ بھی گنگناتے یا سرگوشیاں کرتے رہتے جیسے آواز ذرا سی بلند ہوئی تو زلزلہ آجائے گا۔ سناٹا ایک آسیب کی طرح پندرہ بیس بھرے پُرے گھروں پر مسلط ہو جاتا۔ دُور سڑک پر سے کوئی موٹر گزرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے ہماری گلی کے اندھیرے کی ایک دھجی پھاڑ لی ہے۔ تانگے کے گھوڑوں کی ٹاپیں ہماری گلی کے تابوت میں کیلیں ٹھونکتی ہوئی گزر جاتیں۔ اس دوران میں اگر گلی میں سے کسی کے گزرنے کی آواز آتی تو آٹھ دس کھڑکیوں میں سے لمبی لمبی پرچھائیاں آدھی آدھی باہر لٹک پڑتیں اور کوئی گھبرا کر پوچھ لیتا "کون ہے؟" معلوم ہوتا کوئی بھولے سے اس گلی میں آ نکلا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی کے گھر میں اچانک بچہ ہونے لگا ہے اور کوئی دائی کو بلانے جا رہا ہے۔

شیخ جی بھی ہماری گلی میں شام کے بعد ہی آئے اس لئے بہت سے گھروں کی کھڑکیوں کے پٹ ایک ساتھ کھلے۔ پرچھائیاں آدھی آدھی باہر لٹک پڑیں اور راجہ آصف علی نے پوچھا "کون ہے؟"

"آدمی ہے۔" آواز آئی مگر کچھ ایسی جیسے کوئی لاؤڈ اسپیکر لگا کر بولا ہے۔

اور کھڑکیوں میں نکلے ہوتے لوگ اندھیرے کے باوجود ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے سچ مچ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کم سے کم میں نے تو چار کھڑکیاں پرے راجہ صاحب کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ لی تھیں۔

"آدمی تو ہے پر کون آدمی ہے؟" راجہ آصف علی نے پھر پوچھا۔

جواب ملا "کہیں ہم اپنی کوٹھڑیا کے دھوکے میں تھانے تو نہیں پہنچ گئے ہیں۔ کہیں اب ہماری ولدیت تو نہیں پوچھی جائے گی۔"

ایک منٹ کے بعد میں نے راجہ صاحب کے مکان کے اس ہنگامہ خیز آہنی کھٹکے کے کھلنے کی گونج سنی جو گزشتہ کتنے برسوں سے صرف صبح کی نماز کے وقت کھلتا تھا اور جس کی ٹھن ٹھن سن کر لوگ اپنی گھڑیاں درست کر لیتے تھے۔ میں نے راجہ صاحب کی کمک کو پہنچنا ضروری سمجھا اور جب نیچے پہنچا تو شیخ جی کہہ رہے تھے۔

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ ارے بھئی ہم کیا بتلائیں کہ ہم کون ہیں۔ کیا اس بھری دُنیا میں کوئی بھی شخص اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کوئی مجھ سے اپنا تعارف کرا دے تو واللہ اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ ارے آدمی کو تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں، ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ اور شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے، نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے۔ آہاہا —— آہاہا —— شکنِ زلفِ عنبریں! نگہِ چشمِ سرمہ سا! —— آہاہا۔ تو صاحبو! جب کوئی یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ نگہِ چشم سرما سا کیا ہے تو وہ بے چارہ یہ کیسے بتائے گا کہ وہ کیا ہے اور کون ہے؟ ویسے میرا نام شیخ رفیع الدین ہے اور کام میرا اللہ کا نام لینا ہے اور اس کوٹھڑیا میں جو تالہ پڑا ہے وہ میرا ہے۔ ایک آدمی نے مرگی کا تعویذ لکھوایا تھا۔ تعویذ گھول کر پیا تو اللہ کی رحمت سے تندرست ہو گیا۔ بولا خدمت بتائیے۔ ہم نے کہا سر چھپانے کی کوئی جگہ دلوائیے۔ بڑے بڑے بنگلوں

کے گیراجوں میں رہتے رہتے رگوں میں خون کی جگہ موبل آئیل دوڑنے لگا ہے" تو اس نے اس کوٹھڑیا کا انتظام کر دیا۔ ہم دن کو آجاتے پر آج ہمارے ایک مرید کے باپ کا چہلم تھا، سو یہ بات ہے۔"

سو ہماری گلی میں شیخ جی کیا آئے چند مہینے پہلے کی ساری آبادیاں لوٹ آئیں۔ شام کے بعد کھمبے کا بلب تو خیر بجھا ہی رہتا لیکن شیخ جی چمک اُٹھتے۔ گلی کے ہر گھر کا ایک نہ ایک نمائندہ ان کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ شیخ جی چارپائی کے سرہانے کی طرف اور راجہ آصف علی پائنتی کی طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور آس پاس پوری محفل سج جاتی۔ کوئی اپنے جوتے اُتار کر انہی پر بیٹھ جاتا، کوئی پھٹا ہوا اخبار بچھا لیتا۔ نوجوان در و دیوار سے لگے کھڑے رہتے۔ پھر ایک روز شیخ جی کہیں سے دو چٹائیاں اٹھا لائے اور ان کی کوٹھڑیا اس گلی کی چوپال سی بن گئی۔ زیادہ وقت شیخ جی باتیں کرتے اور حاضرین صرف سوال پوچھنے پر اکتفا کرتے۔ آج تک نہ حاضرین کے سوال رُکے ہیں اور نہ شیخ جی کی باتیں ختم ہوئی ہیں۔ معلومات کا ایک دریا ہے جو کبھی تھمنے میں نہیں آیا۔

"ہا! " شیخ جی گرجدار آواز نکالتے "تحریکِ خلافت کی کیا پوچھتے ہو میاں! ایک شعلۂ جوالہ تھا جو برما سے بولان تک گھوم گیا تھا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! بوڑھے سے بچے تک ہر شخص ترکی ٹوپی پہنے پھرتا تھا۔ عورتوں تک نے برقعوں پہ چاند تارے سجا لئے تھے۔ ایمان تازہ ہو جاتے تھے یہ منظر دیکھ کر۔ ہم نے ایک روز مولانا محمد علی سے کہا "جوہر بھیا! تم اشارہ کر دو تو اس وقت سری نگر سے راس کماری تک بغاوت کی آگ بھڑک سکتی ہے اور وہ انگریز جس نے ہمارے ٹیپوؤں اور سراج الدولاؤں اور بہادر شاہوں کو چبا لیا ہے بصد ذلت عازمِ انگلستان ہو سکتا ہے۔ تم اس وقت کے اسرافیل ہو۔ صور پھونک دو تو حی و قیوم کی قسم قیامت آ جائے۔" مگر مولانا بولے "شیخ جی! بغاوت کرنے سے پہلے بغاوت کی نبض دیکھ لینی چاہیئے۔

کہیں یہ نہ ہو کہ ہم انگریز کے پیچھے پڑ جائیں اور بعض ہمارے ہی بھائی بند ہماری ہی ماؤں بہنوں کو اچکتے پھریں۔" سو میاں! ہم خلافتیوں کو یہی آبرو پر آنچ آجانے کا خطرہ کھا گیا ورنہ آزادی آج سے تیس برس پہلے مل چکی ہوتی اور ہم اس کو ٹھڑیا میں بند نہ پڑے ہوتے۔" پھر وہ اپنے شاگرد خاکی کو پکارتے۔" ارے بھئی خاکی میاں! تم کہاں کھو گئے۔ آخر یہ کیا بدتمیزی ہے کہ جب تمہاری ضرورت نہیں ہوتی تو سر پہ سوار رہتے ہو اور جب تمہاری ضرورت پڑ جائے تو عنقا ہو جاتے ہو۔" محفل میں شگفتگی کی ایک رَو دوڑ جاتی۔ اندھیرے میں بھی خاکی کے کالے چہرے پر اس کے دانت جھلملا جاتے۔ وہ پچیس تیس برس کی عمر اور صوفیانہ وضع قطع کے باوجود بچوں کی طرح سمٹتا ہوا اٹھتا اور شیخ جی کی چارپائی کے پایے سے لگ کر بیٹھ جاتا اور شیخ جی کہتے۔ "مرزا نوشہ کی وہ غزل سناؤ جو کتنے دنوں سے تمہیں رٹا رہا ہوں، مگر دیکھنا تلفظ کی غلطی نہ ہو۔ تلفظ کی غلطی ہو جائے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے شعر کے کلیجے میں چھرا اتار دیا ہے۔"

خاکی منمناتا۔" قبلہ شیخ جی! وہ تو بڑی مشکل ہے۔ تیرسے توسن کو صبا باندھتے ہیں، سُن لیجئے۔"

شیخ جی کہتے۔" ٹھیک ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس میں بھی رُستم کب بندِ قبا باندھتے ہیں، جیسے نشتر ہیں، پر بھئی لوگو! ہم تو خاکی سے وہ غزل سنیں گے۔

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ظاہر ہے کہ لوگ بے جانے بوجھے شیخ جی کی تائید کر دیتے مگر خاکی بدستور سمٹتا رہتا۔" جی نہیں قبلہ بڑی مشکل ہے۔"

"مشکل ہے؟" شیخ جی گرجتے۔" یہ شعر مشکل ہے: ڈھونڈے ہے اس

مغنّیِ آتش نفس کو جی، جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے! اور کیا یہ شعر مشکل ہے: کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں۔ آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے! ــــ اور بھئی لوگو، تم کہیں کہیں کیا کر رہے ہو۔ ہائے شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے! ــــ تو خیر، ہاں بھئی خاکی! بسم اللہ کرو۔"

خاکی جھجک جھجک کر گاتا۔ پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگتا۔ پھر محفل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شیخ جی، ہر شعر اور شعر کے ہر ٹکڑے پر واہ اور آہ کے نعرے لگاتے اور گلی والے بھول جاتے کہ اس وقت اندھیری کھڑکیوں میں ان کی بہوئیں اور بیٹیاں جمع ہیں اور وہ بتوں کی طرح کھڑی خاکی کی سُریلی آواز اور غالب کے رَس بھرے شعر سُن رہی ہیں اور ان میں سے جو ذرا پڑھی لکھی ہیں وہ سوچ رہی ہیں کہ باغ میں بے حجابی کرنے اور نکہتِ گل سے حیا آنے کے درمیان کون سا رشتہ ہے۔ شیخ جی جھومتے جھومتے اچانک کڑک کر کہتے۔

"کیا کہا بے حُجابیاں؟" پھر وہ خاکی کی خشخشی بالوں والی کھوپڑی پر تھپڑ مار دیتے۔ "حجاب کی ح بالکسر ہے۔ چند کہیں کے۔ حجاب کی ح بھی بالکسر ہے اور نقاب کی ن بھی۔ بالفتح پڑھو گے تو یوں معلوم ہوگا جیسے بے حجابیاں کرنے والا مرد ہے۔ زیر زبر کی لطافتوں کو پہچانو منتری کہیں کے۔ سائیکلوں کی گھنٹیاں بناتے ہو کبھی ذوق کی گھنٹی بھی بجا دو۔ ہاں تو کہو ــــ ہا ــــ ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی۔"

ساری گلی میں شیخ جی کے گہرے تعلقات یا تو راجہ آصف علی سے تھے یا مجھ سے۔ راجہ صاحب سے اس لئے کہ ایک ہی دن کے بعد انہوں نے شیخ جی کے صبح کے کھانے کا مستقل انتظام کر دیا تھا اور پھر راجہ صاحب کو بھی مومن اور حسرت موہانی کے وہ بیسیوں اشعار یاد تھے جو محبوب کی آواز یا اس کے لباس کے توسط سے

اس کے جسم کی رنگت سے متعلق ہو جاتے تھے۔ شیخ جی وضو کرتے ہوئے اچانک چلاتے "راجہ صاحب!" کھڑکی میں سے راجہ صاحب "قبلہ" کہہ کر جھانکتے اور شیخ جی کہتے "حسرت کا وہ شعر کیا ہے جس کا دوسرا مصرع ہے ع اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا" راجہ صاحب کہتے "رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں" اور شیخ جی منہ پہ پانی کا چھینٹا مار کر کہتے "آہاہا۔ کہاں کی بات کہاں جا کر نکالی ہے ظالم نے۔ اسے کہتے ہیں شاعری۔ یہ حسرت تو خلافت کے زمانے میں بھی ایسے ترتراتے شعر کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ آہاہا"

مجھ سے ان کے تعلقات کی بنیاد میری چھوٹی سی لائبریری تھی جس سے شیخ جی روزانہ ایک کتاب کے حساب سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر جب کتابوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو رسالوں کی باری آئی اور جب رسالے بھی ختم ہو گئے تو روزانہ کا اخبار لے جاتے۔ جب وہ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں سے اپنے گہرے روابط کا ذکر کرتے یا پھر جب وہ نواب بھوپال، نواب رام پور اور راجہ محمود آباد کے محلوں کی یوں باتیں کرتے جیسے اپنی کوٹھڑیا کی کیفیت بیان کر رہے ہیں یا جب وہ دلی کے انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چاندنی چوک کے بیچ میں ہزاروں کے سامنے ڈانٹ دینے کا قصہ سناتے تو میں چپ چاپ سنتا رہتا کیونکہ شیخ جی کے اندازِ گفتگو میں آورد کا کبھی شبہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ سب باتیں اس روانی اور بے تکلفی سے کرتے جیسے سچ مچ آپ بیتی سنا رہے ہیں مگر ایک روز جب انہوں نے "لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر" پر آہاہا کا نعرہ لگایا تو میں نے بھری محفل میں کہہ ڈالا۔

"شیخ جی! آخر یہ کیا بات ہے کہ آپ کو وہی شعر بھلے لگتے ہیں جن میں انسان کے جسمانی حسن کا ذکر آئے" اس پر شیخ جی ایک لمحے کے لئے یوں خاموش ہو گئے

کہ اس طرح پہلے کبھی خاموش نہیں ہوئے تھے، پھر بڑی گمبھیر آواز میں بولے "تمہیں رفتار کے لفظ سے دھوکا ہوا ہے میاں۔ ٹھیک ہے نا؟ پر دیکھو خفا نہ ہونا۔ تم شعر کو سمجھے نہیں ہو۔ موج مے سے انسان کا دل مراد ہے اور رفتار سے شاعر نے پروردگارِ عالم کا کاروبارِ کائنات مراد لیا ہے اور اسی سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ الٰہ العالمین! لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر۔ سمجھے؟ مگر تم کیا سمجھو گے۔ تمہیں تو اس قسم کی شاعری پسند آتی ہوگی کہ 'تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے' ـــــ بدنصیب ہو۔ ہمارے زمانے میں پیدا ہوتے تو پتہ چلتا کہ شعر کیا چیز ہوتی ہے۔ آج کل تو جو اٹھتا ہے دو شعر گھڑ کر ملک الشعراء بن جاتا ہے۔ سنا ہے تم بھی شعر وعر کہتے رہتے ہو۔ سناؤ تو دو ایک شعر۔ دیکھیں تو کتنے پانی میں ہو"

شیخ جی کو میری بات بری لگی تھی مگر صرف اس حد تک کہ وہ اس گفتگو کے بعد اداس سے ہو گئے۔ محفل خلافِ معمول بارہ بجے سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور اس روز کافی عرصے کے بعد گلی والوں نے شکایت کی کہ کارپوریشن والوں نے کھمبے کا بلب کیوں نہیں بدلا۔

دوسرے روز ہماری گلی کی ایک لڑکی کی شادی تھی اور اس کے گھر نے صبح سویرے سے پوری گلی پر قبضہ جمانا شروع کر رکھا تھا۔ ریڑھوں پر سے دیگیں اتر رہی تھیں۔ قناتیں لگ رہی تھیں اور بار بار گلی کے سرے پر تانگے آ کر رکتے تھے جن میں سے برقع پوش عورتیں زیور چھنچھناتی اور ریشم سرسراتی شادی والے گھر میں داخل ہو جاتیں۔ میں چائے پینے کے بعد دفتر چلا گیا۔ بارہ بجے کے قریب دعوت میں شریک ہونے آیا تو تمام راستے بند تھے براتی قطار اندر قطار کھانا کھا رہے تھے یا سگریٹ پی رہے تھے اور شیخ جی کی کوٹھڑیا کا دروازہ نیم وا تھا۔

میں نے کوٹھڑیا میں جھانکا تو شیخ جی نے اپنا میلا کچیلا کمبل پائنتی پر قریب قریب پٹخ دیا اور گرج کر بولے "کون ہے؟"

پھر مجھے دیکھ کر ان کے تیور سنبھلے اور بولے "آؤ میاں! آجاؤ۔ کھانا کھانے آئے ہو؟"

میں اندر چلا گیا۔ شیخ جی کی کوٹھڑیا کباڑ خانہ بن رہی تھی۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن فرش پر بکھرے پڑے تھے اور ان پر گرد کی تہیں جم چکی تھیں۔ کسی میں دال تھی تو کسی میں سوکھے ٹکڑے۔ مٹی کے ایک پیالے میں چند کھجوریں پڑی تھیں جنہیں چیونٹیوں نے چھلنی کر ڈالا تھا۔ کھڑکی میں زرد رنگ کی، پرانی کتابوں کا ڈھیر اس طرح لگا رکھا تھا کہ اگر اس پر چڑیا بھی آکر بیٹھتی تو وہ زمین پر آ رہتا۔ چارپائی کے سرہانے کی طرف جو تکیہ رکھا تھا اس پر میل کا پلستر ہو چکا تھا اور شیخ جی اسی پر کہنی رکھے، پائنتی پر سے اپنا غلیظ کمبل کھسکا کر میرے بیٹھنے کی جگہ بنا رہے تھے۔

میں بیٹھا تو اچانک فرش پر برتنوں میں حرکت سی ہوئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو شیخ جی بولے "کچھ نہیں میاں! چوہے ہیں۔" پھر وہ اٹھے۔ ننگے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک گئے۔ گلی میں دونوں طرف دیکھا اور دروازے کو بدستور نیم وا کر کے چارپائی پر آ بیٹھے۔ پھر بولے "معاف کرنا میاں! ہم نے ذرا سختی سے پوچھ لیا تھا کہ کون ہے۔ آج صبح سے کوئی دس آدمی ہمارے پاس ایک ایک کر کے آ چکے ہیں کہ شیخ جی! چلئے کھانا کھائیے! اور ہم نے سب سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی ہے کہ ہمیں بخشئے۔ کل رات سے طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی ہے شادی کا مرغن کھانا کھا لیا تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ضرور آئیے۔ کھائیے نہیں تو آکر ذرا سا بیٹھ جائیے۔ ان بدمذاقوں کو کون سمجھائے کہ ہماری ضرورت تو لوگوں کو چہلموں اور عرسوں وغیرہ پر پڑتی ہے۔ ہم شادیوں کی دعوت میں

شریک ہوتے بھلے نہیں لگتے۔ تم ہی بتاؤ میاں! جس شخص نے خود شادی نہیں کی وہ دوسروں کی شادیوں میں کیا دلچسپی لے گا؟"

"تو شیخ جی!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں۔" وہ جیسے لاؤڈ اسپیکر پر بولے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اور وہ ہنس کر بولے "اگر ہم تم سے یہ پوچھیں کہ کیوں میاں! تم نے داڑھی کیوں نہیں رکھی تو تم سوائے اس کے کیا جواب دو گے کہ بس نہیں رکھی۔ سو ہم نے بھی نہیں کی شادی۔ مصروفیت زیادہ رہی، وقت نہیں نکال سکے۔ ہم تو ایک وقت میں ایک کام کرنے کے قائل ہیں سو ہم یا تو خلافت کی تحریک چلاتے یا شادی کرتے۔ ہمیں خلافت عورت سے بھلی لگی اس لئے شادی نہیں کی۔ تم نے شادی کی ہے؟"

"جی!" میں نے کہا۔ "میرے بچے بھی تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں!" شیخ جی بولے "ٹھیک ہے دیکھے ہیں۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔"

گفتگو کا رجحان ذاتیات کی طرف ہو رہا تھا اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ شیخ جی بھی خاموش بیٹھے داڑھی میں انگلیاں ڈالے ٹھوڑی کھجاتے رہے۔ پھر اپنا میلا تکیہ میری طرف بڑھا کر بولے "یہ لو میاں! آرام سے بیٹھو۔ جو پارٹی کھانا کھا رہی ہے وہ اٹھ جائے تو چلے جانا۔"

میں نے تکیہ لے لیا اور شیخ جی سے رات کی گستاخی کی معافی مانگنے کے لئے مناسب الفاظ سوچنے لگا کہ اچانک شیخ جی بولے "کیوں میاں! تم نے شادی تو کر لی پر کبھی عشق بھی کیا ہے؟"

میں نے حیرت سے شیخ جی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کا میل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے سوال کی نزاکت کے پیش نظر

ریر پھیر سے کام لینا چاہا۔ سو پوچھا "کون سا عشق شیخ جی؟ حقیقی یا مجازی؟"

شیخ جی طنزاً ہنسے "حقیقی عشق تم کیا کرو گے میاں! دُنیا دار آدمی حقیقی عشق نہیں کر سکتا۔ تم سے ہم نے مجاز کی بات کی ہے۔"

میں نے گھبرا کر کہا "جی! کیا ہے۔ سب کرتے ہیں۔ کون ہے جس نے نہیں کیا؟"

اور شیخ جی بولے "مثلاً ہم نے نہیں کیا۔ قسم لے لو جو ان ہاتھوں نے کبھی کسی عورت کو بھولے سے بھی چھوا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹ بول رہے ہیں تو ابھی تمہارے سامنے ہماری انگلیوں کی پوروں میں سے کیڑے نکل پڑیں۔ مسیں بھیگ رہی تھیں تو اماں مرحومہ ہماری ایک عم زاد کا رشتہ ڈھونڈھ لائیں۔ ہمیں سنا سنا کے کہنے لگیں کہ لڑکی پانی پیتی ہے تو گردن کی شفاف جلد میں سے پانی اُترتا ہُوا دکھائی دے جاتا ہے۔ بتانے لگیں کہ چپّہ چپّہ بھر لمبی آنکھیں ہیں اور ان پہ چپّہ چپّہ بھر خمیدہ پلکیں ہیں۔ غرض انہوں نے تو حد کر دی مگر ہم نے ابا مرحوم سے جا کر کہہ دیا کہ نہیں قبلہ! ابھی تو ہم داستان بوستان ہی کو سمجھ نہیں پائے ابھی تو ہمیں علم کے کتنے مقامات طے کرنے ہیں، علم حاصل کریں تو بیوی بھی حاصل کر لیں گے پھر چند برس بعد خلافت کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس دوران میں ابا مرحوم کو ایک اور رشتہ سوجھا مگر اس مصیبت سے ہم یوں محفوظ رہ گئے کہ رشتے والوں کو ہماری درویشی پسند نہ آئی۔ پھر درس و تدریس میں اُلجھے تو کبھی یہ تک نہ سوچا کہ عورت نام کی کوئی جنس، اس دُنیا میں بستی بھی ہے۔"

شیخ جی یہ باتیں کچھ ایسی سنجیدگی سے کرتے رہے اور اس دوران میں ان کی سُرخ و سفید رنگت پر کچھ ایسی زردی کھنڈی رہی کہ مجھے شیخ جی کی غلط بیانی کا یقین ہو گیا۔ میں نے سوچا جس شخص کے خطوط اتنے خوبصورت ہیں، جس کی آواز میں اتنی

جان ہے، جو علوم کا ذخیرہ ہے اور جسے حافظؔ اور غالبؔ رٹے پڑے ہیں اور پھر جو اس دُنیا میں پچپن برس تک گھومتا رہا ہے جہاں کسی نہ کسی بھیڑ بھڑکے میں ایک آدھ بار ہر مرد اور عورت کا کھوے سے کھوا چھل ہی جاتا ہے وہاں شیخ جی نے کس مینار کا انتظار کئے رکھا ہے کہ اس کی چوٹی پہ پچپن برس تک بیٹھے رہے اور اب تک بیٹھے ہیں، یہ ناممکن ہے۔"

میں نے شیخ جی سے کہہ دیا "نہیں قبلہ! یہ ناممکن ہے۔ میں نہیں مانتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آسمان سے کوئی فرشتہ بھی اترے تو شادی کئے بغیر واپس ہونے کو اس کا جی نہیں چاہے گا۔"

شیخ جی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا "تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟ تمہیں ایک بار بتا جو دیا کہ ہم نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں، سمجھے؟" پھر فوراً بولے "جاؤ کھانا کھا لو۔"

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو خاکی اندر گیا اور شیخ جی بولے "خاکی کو بھی ساتھ لیتے جاؤ میاں! جاؤ بھئی خاکی! خوب ٹھونس کے کھا لو۔ کل شام تک کی چھٹی کر لو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ ہمارے مزاج ٹھیک نہیں ہیں۔" اور انہوں نے پائنتی کی طرف سے تکیہ اُٹھا کر سرہانے کی طرف پھینکا اور کمبل کھینچ کر لیٹ گئے۔

دوسرے دن سے شیخ جی کے ہاں پھر وہی محفلیں جمنے لگیں۔ شیخ جی بڑے بڑے لیڈروں کے ساتھ کلکتہ سے پشاور اور بمبئی سے سری نگر تک کے دوروں، جلسوں اور جلوسوں کے قصّے سُناتے۔ خاکی سے غالبؔ کی غزلیں سنتے اور رات کے بارہ بجے تک اندھیری گلی میں شعروں پہ واہ و مرحبا کے ڈونگرے برساتے رہتے۔ وہ دن بھر گلی کے بچّوں کے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلتے۔ پھر کسی بچے کو ننگ دھڑنگ گھر سے باہر نکلتا دیکھتے تو اس کی ماں یا بہن کو پکار کر کہتے "اے بی بی! اس مختار

کو کہیں اکھاڑے میں اُتارنے کے لئے تو نہیں بھیجا؟ یہ صاحب باہر گلی میں ننگے تشریف لے آئے ہیں، انہیں لے جاؤ"۔ کوئی سودا بیچنے والا آتا اور اُوپر کھڑکیوں میں سے لٹکتی ہوئی عورتیں اس سے نرخ پر جھگڑتیں تو شیخ جی فوراً گلی کی عورتوں کی مدد کو پہنچتے۔ خاکی بھی اب دن بھر کوٹھڑیا کے سامنے بیٹھا سائیکلوں کی گھنٹیاں بناتا بجاتا رہتا۔ ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ غالب کی غزلیں گنگناتا اور شیخ جی اس کا تلفظ درست کرتے رہتے۔

کوئی ایک مہینہ یوں ہی معمول کے مطابق گزر گیا۔ ان دنوں راجہ آصف علی محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے کیونکہ ان کی بیٹی کی شادی قریب تھی اور وہ ہر وقت اسی شادی کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے۔ پھر جس شام کو گلی والوں کو معلوم ہوا کہ کل راجہ صاحب کے ہاں برات آ رہی ہے اور تمام گھروں سے کرسیوں اور دریوں وغیرہ کی ضرورت پڑے گی تو اس رات کو شیخ جی کے ہاں کی محفل سونی سی رہی۔ شیخ جی کے بجائے کسی اور نے خاکی سے کوئی غزل گانے کو کہا۔ وہ غالب کی ایک غزل گانے لگا۔ ع۔ "مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے"۔ تیسرے شعر پہ پہنچا تو شیخ جی نے اسے ایک غلطی پر اس زور سے ڈانٹا کہ محفل سناٹے میں آ گئی۔ پہلے انہوں نے خاکی کو چند گالیاں دیں پھر بولے "وضع احتیاط نہیں، وضع احتیاط۔ اضافت ہے۔ پھر وضع احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم" ذرا سی خاموشی کے بعد وُہ پھر کڑکے "مت بکو نا۔ بک رہے ہو تو بکتے جاؤ۔"

خاکی مشین کی طرح گانے لگا:۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پہ ہوس
زلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اور جب خاکی آخری مصرع پر پہنچا تو شیخ جی نے اسے کچھ ایسی وحشت ناک آواز میں ڈانٹا کہ حاضرین دم بخود رہ گئے۔ کم سے کم مجھے احساس ہوا کہ خاکی نے ان اشعار میں تلفظ کی کوئی غلطی نہیں کی تھی اور شیخ جی نے بھی جب اسے ڈانٹا تو اس کی کسی غلطی کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا۔ بس عجیب آوازیں کستے رہے "بکے جا رہا ہے، بکے جا رہا ہے۔ غزل کا ناس مار دیا تان سین کے سالے نے۔ بس! اب آج کے بعد یہاں کوئی نہیں گائے گا۔ اس کوٹھڑیا سے کسی کے گانے کی آواز نہیں آئے گی۔ بس!"

لوگ قبل از وقت اُٹھ کھڑے ہوتے اور خاکی کوٹھڑیا کے ایک کونے میں جا کر گٹھڑی سا بن کر لیٹ گیا۔

دوسرے روز میں دوپہر کو دعوت میں شریک ہونے آیا تو گلی میں بلا کی رونق تھی۔ ساری گلی کو شامیانے سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور براتیوں کی ایک لمبی قطار بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ راجہ آصف علی نے دُور سے مجھے دیکھا تو لپک کر بولے "بہت اچھا ہوا آپ وقت پہ آ گئے۔ بس آپ ہمارا اتنا کام کر دیجئے کہ شیخ جی کو منا لائیے۔ وہ ہم سے خفا ہو گئے ہیں اور اب تک یہ نہیں بتایا کہ کیوں خفا ہیں۔ آج صبح کی نماز میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ اندر کوٹھڑیا میں لیٹے ہیں۔ کہتے ہیں طبیعت بوجھل ہے، بزرگ آدمی ہیں ان کا دعوت میں شریک ہونا ضروری ہے۔ ہم سب کو تو ڈانٹ دیا۔ اب آپ ہی قسمت آزمائی کیجئے۔"

کوٹھڑیا کا دروازہ بھِچا ہوا تھا۔ مَیں نے اسے کھولا تو لیٹے ہوئے شیخ جی تڑپ کر اُٹھ بیٹھے اور گرجے "کون ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو بولے "اچھا تو میاں! آؤ۔ کھانا کھانے آئے ہو؟"

میں چارپائی پر چپ چاپ بیٹھ گیا تو وہ بولے "صبح سے راجہ صاحب نے جان ضیق کر رکھی ہے۔ کہتے ہیں دعوت میں ضرور شرکت کرو۔ اب بھئی، میں کیسے شرکت کروں۔ شادیوں کی دعوتوں میں شرکت مجھے کچھ بھلی نہیں لگتی۔ عرسوں، چہلموں کی دوسری بات ہے۔ شادی پر خوشی منانا تو میاں میرے نزدیک بداخلاقی پر خوشی منانا ہے۔ راجہ صاحب کی اس لڑکی کو میں نے کھڑکی میں کھڑے ہوتے ہزار بار دیکھا ہے۔ ایسی بھولی بھالی، آسمان کی حور سی لگتی تھی اور اب راجہ صاحب اسے نہ جانے کس لونڈے کے حوالے کیے دے رہے ہیں۔ یعنی یہ معصوم اب ایک غیر آدمی کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اب یہ بچے پیدا کرے گی اور ناس مار دے گی اپنا۔ اس بات پر اگر راجہ صاحب خوشی منا رہے ہیں تو منائیں، وہ مختار ہیں، پر ہم سے کیوں کہتے ہیں کہ آکر شرکت کرو۔ بھئی نہیں مانتا جی۔ نہیں آسکتے۔ قصہ ختم۔"

میں نے کہا "شیخ جی! آپ پسند کریں یا نہ کریں پر آپ کو شرکت کرنی چاہیئے۔ آپ بزرگ آدمی ہیں، نیکوکار ہیں۔ آپ کی شرکت سے برکت ہوگی۔"

اور اچانک شیخ جی کے تیور عجیب غیر معمولی انداز میں بدل گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے پسیجے ہوئے ہاتھ میں لے لیا اور لپٹی اور بندھی ہوئی آواز میں بولے "تم کہتے ہو میں بزرگ ہوں، نیکوکار ہوں۔ تم مجھے احمقوں کی جنت میں لے جانا چاہتے ہو؟ نہیں میاں! میں نیکوکار نہیں ہوں۔ نیکوکار ایسے نہیں ہوتے۔ یہ اپنی گلی میں بجلی کے کھمبے کا بلب دیکھتے ہو؟ اس میں وہ سب کچھ ہے جو اس کے دوسرے بھائیوں میں ہوتا ہے مگر اسے بلب کون کہے جبکہ یہ جلتا ہی نہیں۔ بلب وہی ہے جو جلے۔ نیکوکار وہی ہے جو نیک کام کرے اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی مخلوق کی خدمت کرے۔ پر میاں! یہ بتاؤ کیا عورت خدا کی مخلوق نہیں ہے؟"

میں خاموش رہا اور میرے ہاتھ پر شیخ جی کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہونے

لگی۔ لرزتی آواز میں بولے "اور اس روز جو ہم تمہیں بتا رہے تھے کہ ہم نے زندگی بھر کسی عورت کو چھوا تک نہیں تو ہم غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ عورت کے جسم کو چھوا جائے تو کیسا لگتا ہے۔ تم ہمیں نیکوکار کہتے ہو حالانکہ ہم وہ بدنصیب ہیں کہ دنیا بھر کی عورتوں میں سے کسی ایک بیچاری کی بھی دلجوئی نہ کر سکے تو ایسی حالت میں ہم کس منہ سے کسی عورت کی شادی میں شریک ہونے جائیں میاں!"

پھر وہ ایک دم ٹوٹ کر رو دیئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "راجہ صاحب سے کہہ دو کہ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں۔ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔"

دُوربین

ایک دن میں نے جی کڑا کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ ——— "اگر یہی بات ہے تو لاؤ اس بحث کو کسی نتیجے تک بھی پہنچائیں۔"

ہم اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھے تھے جو باغ کے ایک گوشے میں پھنسا پھنسا اس جھٹپٹے میں کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی میزیں اور کرسیاں بھی پھولوں کی جھاڑیوں کی طرح زمین سے اُگ آئی ہیں اور جیسے جب خزاں آئے گی تو اس کی منقش چھت بھی پھولوں کی طرح کملا کر ٹپک پڑے گی۔

بحث کے نام سے رؤف کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ویسے تو اس کی آنکھوں کا حسن ہی یہی تھا کہ ان میں بار بار ستارے سے دمک جاتے تھے مگر بحث کا ذکر آتے ہی جیسے یہ ستارے ایک جگہ رُک جاتے اور وہ میری طرف کچھ ایسی شرارت سے پُر اور ترس سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہے "اگر شکست کھانے کا ایسا ہی شوق ہے تو آؤ ایک اور شکست کھا لو۔"

"ہو جاتے۔" اس نے میز پر کہنیاں رکھ کر چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں سجا لیا۔ "فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ چند دنوں میں امتحان کی تیاریاں شروع ہو گئیں تو ہماری دو برس کی بحث ادھوری رہ جائے گی۔"

اس وقت ریستوران میں اکا دکا میز ہی خالی تھی، لوگ یوں کڑک کڑک کر باتیں کر رہے تھے جیسے سب جلدی جلدی سے کسی بحث کے نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایک میز کے لوگوں کا دوسری میز کے لوگوں کی باتیں سُننا خارج از بحث تھا کیونکہ شور اس قدر تھا کہ شاید ایک ہی میز کے لوگ بھی ایک دوسرے کی باتیں نہیں سمجھ رہے تھے۔

ہمارے درمیان جب بھی یہ بحث ہوئی رؤف آہستہ آہستہ شریر ہوتا گیا اور میں آہستہ آہستہ سنجیدہ ہوتی گئی مگر آج تو میں بحث کی ابتدا کرنے سے پہلے ہی سنجیدہ ہو رہی تھی اس لئے رؤف بھی مجھے ذرا سا چونکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی مسلسل چمکتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر یوں گاڑ رکھی تھیں جیسے وُہ نظروں کے بجائے میرے چہرے کو انگلیوں سے چھو رہا ہے۔

"سنو!" میں نے ہمت کر کے کہا۔ "آج ہیر پھیر کی باتیں نہیں ہوں گی یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

رؤف مسکرایا۔ "یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگ سے پوچھے کہ کیا تم جلتی ہو؟"

"یہ غلط ہے!" میں نے احتجاج کیا۔ "میں نے غیر محسوس بات کی ہے اور تم محسوس کی مثال دے رہے ہو۔ تمہاری حقیقت پسندی آگ کو محسوس کر لیتی ہے مگر محبت کو کیوں محسوس نہیں کرتی؟"

وہ بولا۔ "میں محبت کو محسوس نہ کرتا تو تم سے محبت ہی کیوں کرتا؟"

"یعنی ثابت ہوا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" میں نے جیسے بحث کے ایجنڈے کی پہلی شق جیت لی تھی۔

"ثابت کیا ہوا!" وہ کرسی کو آگے کھسکا کر اور میز پر تقریباً سوار ہو کر بولا۔ "یہ بات بھی کوئی ثابت کرنے کی ہے؟ ہم لیلیٰ مجنوں تھوڑی ہیں! محبت کر رہے ہیں!"

محبت ہو رہی ہے۔ قصہ ختم!"

"جی نہیں" وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا "کھانے پینے کی مثال غلط ہے۔ کھانے پینے کے بغیر تو انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔"

"تو کیا محبت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟" میں نے پوچھا اور اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اب کے تو اس نے بھی اپنے چہرے پر میری انگلیاں محسوس کی ہوں گی۔

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ کرسی پر پہلو بدل کر اس نے میز پر پہلے ایک کہنی ٹیکی، پھر اسے اٹھا لیا اور دوسری کہنی ٹیک دی۔ اسے بھی اٹھا کر جیسے سرگوشی میں بولا "کہاں لے جانا چاہتی ہو مجھے؟"

"کسی نتیجے تک!" میں نے فاتحانہ شان سے کہا۔

"دیکھو" اس نے بڑی متانت سے بولنا شروع کیا "جو بحث تم شروع کرنا چاہتی ہو، اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ نتیجہ بس اتنا سا ہے مگر تمہیں تو اردو فارسی شاعروں نے خراب کر رکھا ہے جو محبوب کی خاطر سمندروں کو چیرتے، پہاڑوں کو سرمہ بناتے اور اس کے بالوں میں ستاروں کی افشاں چنتے ہیں۔ پگلے یہ نہیں جانتے کہ یہ ستارے تو ہماری زمین سے بھی بڑے بڑے کرّے ہیں۔ جلی ہوئی چٹانوں اور آسیبی سنّاٹوں کے بلے، سیدھی طرح یہ نہیں کہیں گے مجھے تم سے محبت ہے۔"

میں نے کہا "بات یہ ہے رؤف کہ یہی تو اصل بحث ہے۔ محبت جب ایک کٹّر سائنسدان کے دل پر بھی دستک دیتی ہے تو اس کے لئے ستارے جگنو بن جاتے ہیں۔ محبت اسے تتلاتا ہوا بچہ بنا دیتی ہے جو چاند کی طرف ہمکتا ہے اور ستاروں کے لئے ضد کرتا ہے۔ محبت اس کی آنکھوں پر سے دوربین اتار لیتی ہے اور وہ سیدھے سادے اور سچے انسان کی طرح ستاروں کو یوں دیکھتا ہے جیسے وہ زمین پر سے نظر آتے ہیں۔ آج تک کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بھی چاند میں چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا کے سینے

میں اپنے علم کا خنجر نہیں اتار سکا۔ تم ہزار ڈھنڈورا پیٹتے پھرو کہ چاند تو غاروں سے پٹا ہوا ہے اور اگر انسان کو زمین پر سے اٹھا کر چاند میں اتار دیا جائے تو وہ پھڑک کر مر جائے مگر کیا تم اس طرح انسانوں کو چاند سے نفرت کرنا سکھا سکو گے؟ وہ تو تمہاری دوربینوں اور تمہارے راکٹوں کے باوجود چاند کو اس کی چاندنی ہی سے پہچانیں گے۔ یہ جو چاندنی اور چاند کے غاروں کے درمیان ذرا سا فرق ہے نا تو اسی کا نام انسان ہے اور یہی شاعری ہے۔"

"بہت اچھا!" رؤف نے میری دلیل کو اپنی شرارت سے کاٹنا چاہا "میں نے دوربین الگ رکھ دی ہے اب بولو۔"

مگر میں تو آج یہ تہیّہ کر کے آئی تھی کہ فیصلہ کر کے ہی اٹھوں گی۔ عنقریب سالانہ امتحان شروع ہو رہے تھے۔ پھر ہمیں ادھر اُدھر بکھر جانا تھا، اور میں سوچ تک نہیں سکتی تھی کہ میں اس کے بعد رؤف کو عمر بھر نہیں دیکھ سکوں گی یا اگر زندگی کی مسافت میں کسی دوراہے پر ہماری مڈبھیڑ ہوئی بھی تو صورت آشناؤں کی طرح ہم ایک دوسرے پہ "ہیلو" کی کنکریاں اچھال کر آگے بڑھ جائیں گے۔ میں تو دن بھر کی باتوں اور بحثوں کے بعد بھی جب رؤف سے الگ ہوتی تھی اور یہ سوچتی تھی کہ اب ہم کل کالج ہی میں مل سکیں گے تو ایک لمحے کے لئے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یکایک برفباری ہونے لگی ہے اور میں اپنے اندر سکڑی جا رہی ہوں۔ راتوں کو میں کتنی کتنی دیر تک دن بھر کے واقعات کو کتنی کتنی بار اپنے ذہن میں دہراتی اور جب صبح کو اٹھتی تو کالج جانے سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی تیار ہو جاتی تھی۔ یوں مجھے ہر صبح کو ایک صدی گزارنا پڑ جاتی تھی، مگر جب میں رؤف سے پوچھتی تھی کہ اس کا وقت کیسا کٹا تو وہ مجھے بتاتا کہ "خوب لطیفے رہے۔" یا "میں نے فلاں کی فلاں کتاب پوری کی پوری رٹ ڈالی۔" یا "دوستوں میں پھنس گئے اور چھ بجے سے بارہ بجے تک اکٹھی دو فلمیں دیکھ ڈالیں۔" یہی باتیں

تھیں جن پر میں کئی بار ضبط کرنے کے باوجود رو دی اور پھر محبت کے فلسفے پر ڈٹ ڈٹ کر بحثیں کیں۔ اسے یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ دیتا کہ تمہاری طرح مجھے صبح کا انتظار اس لئے نہیں ہوتا کہ مجھے ایک بہت بڑی حقیقت کا یقین ہوتا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ جب شام ہوتی ہے تو صبح ہونے میں صرف دس بارہ گھنٹے باقی ہوتے ہیں۔

میں نے رؤف کے سامنے ہمیشہ تسلیم کیا کہ میں محبت کرنے والی ایک لڑکی کے علاوہ ایک طالب علم بھی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بیٹی بھی تھی۔ اپنے وطن کی شہری اور انسانی برادری کی ایک رُکن بھی تھی مگر میری ان تمام حیثیتوں پر رؤف یوں چھایا ہوا تھا جیسے درخت کے تنے پر شاخیں چھائی رہتی ہیں۔ میں اپنی ہر حیثیت میں رؤف کے ساتھ وابستگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتی تھی۔ انسانی برادری سے پیار کی بات آتی تو رؤف مجھے اس بزم کا صدر نشین نظر آتا۔ رؤف جیسے فرزند وطن کی رعایت سے مجھے سارا وطن حسین معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ کی کتنی ممنون تھی کہ انہوں نے اپنی محدود آمدنی کے باوجود میری تربیت کچھ اس انداز سے کی تھی کہ مجھ جیسی عام سی صورت کی ایک لڑکی، رؤف تک کی نظروں میں جچ گئی تھی حالانکہ رؤف جس سوسائٹی کا رکن تھا اور جس سوسائٹی میں گھومتا تھا وہاں ایسی ایسی لڑکیاں پائی جاتی تھیں کہ کوئی آنکھ بھر کر دیکھے تو اس کی نسیں پھٹ جائیں۔ رہی میری طالب علمی تو ممکن ہے قدرت میری طالب علمی کے رُوپ میں دراصل میری شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہو۔

میں جانتی تھی کہ رؤف مجھ سے محبت کرتا ہے مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے اپنی کتابوں اور اپنے پروفیسروں سے، اپنے دوستوں اور ان کے لطیفوں سے بھی محبت ہے۔ ایک بار اُس نے کالج لان کی ایک بنچ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "اس بنچ پر بیٹھ کر میں نے ملٹن اور گوئٹے کو پڑھا ہے، اور اسی پر لیٹ کر میں نے عجیب عجیب دیوانوں کے سے خواب دیکھے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میری آدھی رُوح اس بنچ میں اُتر گئی ہے۔ جی چاہتا ہے، امتحان ختم ہوں تو ایک رات چپکے سے آؤں اور اسے اکھاڑ کر لے جاؤں۔" اور میرا کیسا کیسا جی چاہا تھا کہ میں ایک رات چپکے سے کلہاڑی لے کر آؤں اور اس بنچ کی لکڑی کو چیر پھاڑ کر ڈال دوں۔

اس روز بھی اُس نے کہا "بھئی سنو تو، جب میں بے جان لکڑی کے چند ٹکڑوں سے، جنہیں بنچ کہتے ہیں، اتنا پیار کر سکتا ہوں تو آخر تم تو انسان ہو، اور تم تو بڑی پیاری انسان ہو۔ میں تمہارے اس شبہے کو کیسے دُور کروں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ آخر یہ میری جماعت کے نصاب میں تو نہیں لکھا ہے کہ میں سوائے متاب کے کسی لڑکی کی طرف نہ دیکھوں۔"

بحث کو ٹھکانے لگتا دیکھ کر میں نے کہا "رؤف! سنو، بات یہ ہے کہ یہ سب ٹھیک سہی، مگر سنو، سُن رہے ہو نا؟"

"ہاں ہاں۔" اُس نے کُرسی کو میز کے بالکل ساتھ لگا لینا چاہا، مگر وہ پہلے ہی میز کے ساتھ جُڑی ہوئی تھی۔

"سنو" میں نے کہا "وہ لوگ میری سمجھ میں کبھی نہیں آئے، جن کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں، اور رؤف! تم ایک نہیں دو ہو۔ ایک وہ جو میرے سامنے بیٹھے ہو اور دوسرے وہ جو یہاں سے اُٹھنے کے بعد ہو جاؤ گے۔"

"اور تم کتنی ہو؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں؟" میں نے کہا "میری شخصیت صرف ایک ہے، یہ جو تمہارے سامنے ہے۔"

"بہت اچھا!" اس نے اپنے آدھے دھڑ کو میز پر تقریباً پھیلا دیا اور میرے بالکل قریب ہو کر بولا "اگر تم سے تمہاری کوئی ہم جماعت پوچھے کہ ان دنوں تم رؤف کے ساتھ محبت کر رہی ہو تو کیا انجان بنتے ہوئے تمہاری ایک اور شخصیت پیدا نہیں ہو جائے گی؟ یا جب تم فیل ہو جاؤ گی اور تمہارے ابا اس کی وجہ پوچھیں گے اور تم انہیں یہ بتانے کی بجائے کہ تم محبت میں مصروف رہیں، یہ بتاؤ گی کہ امتحان کے دنوں میں یکایک تمہیں بخار نے آ لیا تھا، تو کیا یہ تمہاری وہی شخصیت بول رہی ہو گی جو اس وقت میرے سامنے ہے؟"

میرے فق چہرے اور ڈبڈبائی آنکھوں سے رعب کھائے بغیر وہ بولتا چلا گیا "میں یہ نہیں کہتا کہ انسان ہمیشہ دو یا اس سے زیادہ شخصیتوں میں بٹا رہے گا۔ ممکن ہے جب اس کے سامنے سے غیر ضروری پابندیاں ہٹ جائیں تو اُسے اپنی شخصیت کے ٹکڑے کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ مگر تا بی! اس زمانے میں، جس میں ہم زندہ ہیں اور جس سے باہر نکل کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، ذرا سی ریاکاری بڑی چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو دن میں ہر آدمی کے سو جھوٹ پکڑے جائیں۔"

"تو کیا میں جھوٹی ہوں؟" میں نے بحث میں کسی ربط کی پروا کئے بغیر چیخ کر کہا۔ رُکے ہوئے آنسو، یکایک میری آنکھوں میں سے اُبل پڑے اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے میری طرف کچھ اس شوق سے دیکھا، جیسے تھیٹر ہال میں گھنٹے بھر کے انتظار کے بعد آخرکار اسٹیج پر سے پردہ اُٹھا ہے۔

رؤف فوراً اُٹھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک بیرے کو بازو سے پکڑ کر اُس کے ہاتھ پر دس روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا، اور پھر مجھے کلائی سے پکڑ کر، ریستوران میں سے نکال لے گیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ اس دوران میں کچھ نہیں بولا۔ بس اُس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑتی گئی۔ پھر اُس

کا ہاتھ میری کلائی سے کھسک کر میرے ہاتھ میں آ گیا اور اس نے میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں پیوست کر لیں۔

پھر جب وہ ایک گھنے کنج میں پہنچا تو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر، میری طرف یوں دیکھا، جیسے ایک ننھی سی بچی کو زمین پر سے اُٹھا کر دیکھ رہا ہے کہ کہیں اُسے چوٹ تو نہیں آئی۔

"بُرا نہ مانو تو تم سے ایک بات پوچھوں؟" اُس نے آہستہ سے کہا۔

میں خاموش رہی۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا بھرے مجمع میں یوں چیخ کر بولنا اور رو دینا ہی محبت کی نشانی ہے۔

اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر پوچھا "جانتی ہو آج کی بحث میں کون جیتا؟"

اب کے بھی اُس نے سوال کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بولا۔ "تم جیتیں۔"

"میں جیتی؟" میں نے پوچھا "میں کیسے جیتی جب جیتے تم اور تمہاری منطق اور تمہارا ہزار شخصیتی فلسفہ۔"

"نہیں تمہیں جیتیں" اُس نے مجھے وقار سے لپٹاتے ہوئے کہا "یہ جو محبت کا قصہ ہے نا، اس میں ہمیشہ عورت ہی جیتتی ہے۔ زندگی کا یہی تو ایک پہلو ہے جس میں صنفِ قوی کو صنفِ لطیف کی قوت کا اعتراف گھٹنے ٹیک کر کرنا پڑتا ہے۔ سو میں ہارا۔"

اور میں نے جیسے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے دیکھ کر پوچھا "اگر تم ہارے تو مانو کہ تمہارے ساتھ تمہارا فلسفہ بھی ہارا۔"

"بحث نہ چھیڑو" وہ بولا "ایک بار کہہ جو دیا کہ میں ہارا۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کرو" میں نے کہا ——— اور میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا،

جس کے بارے میں پچھلے دو برس سے میں قریب قریب ہر رات نئے سرے سے سوچتی تھی۔

”ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہی ہونا چاہیئے۔“

”ہونا چاہیئے نہیں، یہی ہوگا۔“ میں نے ضد کی۔

اور اس نے مجھے ایک بار پھر لپٹا لیا۔

اس دوران میں رؤف کے کئی خط آئے۔ مگر یہ آخری خط رجسٹرڈ تھا۔ میں نے مکان کی چھت پر جا کر اسے کھولا۔ لکھا تھا۔

تابی ——— میری دوست!

امی اور ابا، دونوں سے ایک بار نہیں، کئی بار کہہ دیکھا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں مہتاب پڑھی لکھی سہی مگر اس کے ابا نے چھوٹے سے مٹیاری کی حیثیت ہی سے تو کاروبار شروع کیا تھا اور لوگ کہیں گے کہ رانا عرفان الٰہی کے اکلوتے بیٹے نے ایک مٹیارن کو گھر میں ڈال لیا ہے، مجھے اس کا بڑا ہی دُکھ ہے۔ مگر یہ زمانہ جس میں ہم زندہ ہیں اور جس سے باہر نکل کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم میاں بیوی نہیں بن سکے تو بھی دوست ضرور رہیں۔ موج ساحل پر رُک نہیں سکتی۔ لیکن اپنے وجُود کے ایک حصّے کو کاٹ کر ریت میں ضرور جذب کر جاتی ہے۔ بھیگی ہوئی ریت، موج و ساحل کی دوستی کی نشانی ہے۔ تم اگر عام لڑکیوں کی طرح رونے نہ بیٹھ جاؤ اور میری تجویز پر ٹھنڈے دل سے ذرا سا غور کر لو تو تم اُداس نہیں ہو گی۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔

تمہارا دوست

رؤف

خط پڑھنے کے فوراً بعد مجھے خودکشی کر لینے کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی اچانک مجھے امی یاد آگئیں، جن کے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے اُن کی آنکھیں اور بھی چھوٹی ہو گئی تھیں اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے مجھے نہیں دیکھ رہیں، جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں، جیسے میری امی کی نظروں کے سامنے سے آسمان بھی ہٹ گیا ہے اور وہ اتنے عظیم خلاء کے کنارے پر کھڑی ڈول رہی ہیں، کہ اگر مَیں نے چیخ نہ ماری تو وہ اس خلاء میں کُود پڑیں گی۔

پھر ابا حسبِ عادت مسکراتے ہوتے اپنی چھڑی سے، فرش اور دروازے اور صوفے اور امی کو بجاتے ہوئے آئے، اور میری طرف دیکھتے ہی اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ان کے ہاتھ کی چھڑی کی طرح فرش پر گر پڑی۔ پھر ان کی آنکھیں جیسے گھُل کر پانی بن گئیں اور وہ ہُوا کو ٹٹولتے ہوئے دروازے کی طرف یوں کانپتے ہوئے جانے لگے، جیسے ساری دنیا کو اپنی مدد کے لئے پکارنے چلے ہیں۔

پھر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میں اپنے کمرے سے گنگناتی ہوئی نکلی اور اپنی طرف دیکھتے ہی ٹھٹک گئی اور میں نے دیکھا کہ میری انگلیوں کی پوروں پر خون کی بوندیں جمع ہیں۔ خون کا ایک بڑا سا قطرہ میری ٹھوڑی پر لرز رہا ہے۔ میرے کانوں کی لوؤں میں خون کے قطرے، سُرخ آویزوں کی طرح جھمجھا رہے ہیں۔ جہاں میں کھڑی ہوں وہاں خون کی ایک ننھی سی تلیا بن رہی ہے اور میرا لباس میرے جسم سے چپکا پڑ رہا ہے۔

میں اپنے اس خون آلود وجود سے ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئی، اور جب میں ہانپتی ہوئی اپنے ہوسٹل میں آئی، تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں کُرسی پر بیٹھی میز پر سر رکھے آنکھیں بند کئے پڑی ہوں اور رؤف کا خط میری مٹھی میں ہے اور ساتھ والے کمرے میں لڑکیاں اوفیلیا بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مگر انہیں ڈھب کا کوئی ”ہیملٹ“ نہیں مل رہا ہے۔ ”چلو مہتاب کو آزماتے ہیں۔“ ایک آواز آتی ہے۔

اور میں چیخ اُٹھتی ہوں، اور وہاں سے بھاگ آتی ہوں۔

میں بھاگتی بھاگتی اپنے مکان کی آخری سیڑھی تک پہنچ گئی۔ جہاں امی اور ابا جیسے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے لپک لیا، تب میں نے محسوس کیا کہ میں مرجاؤں گی۔

اور میں ابھی تک مر رہی ہوں۔

شکنیں

میں نے اتنا مکمل اور بے داغ لباس بہت کم آدمیوں کا دیکھا ہے۔ چند لمحے بیٹھنے سے اچھے سے اچھے سوٹ میں بھی کہیں نہ کہیں ایک آدھ شکن ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر غفور کے لباس میں کوئی شکن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس ڈر کے مارے ہمیشہ چلتا رہتا ہے کہ کہیں بیٹھنا نہ پڑ جائے یا جس طرح بعض عورتوں کے پاس لپ اسٹک ہر وقت موجود رہتی ہے، تاکہ حسبِ ضرورت ہونٹوں میں آب پیدا کی جاتی رہے، اسی طرح غفور کے پاس کوئی جیبی استری ہے کہ اِدھر پتلون پر ایک آدھ شکن نمودار ہوئی، اُدھر غائب کر دی گئی۔ بڑے بڑے پارچہ فروشوں اور درزیوں کی دکانوں کے باہر آپ نے بے شکن سوٹوں میں ملبوس ڈمیاں تو دیکھی ہوں گی۔ غفور کو بھی ایک ڈمی ہی سمجھ لیجئے۔ مگر صرف لباس کی حد تک۔ ویسے تو وہ بڑا جیتا جاگتا انسان تھا۔

پہلی بار جب غفور سے میرا تعارف کرایا گیا تو وہ بیمہ ایجنٹ تھا۔ اس لئے مجھے اس کی خوش لباسی پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ جس محفل میں اس سے ملاقات ہوئی، وہاں بڑے پائے کے فن کار اور فن دوست لوگ جمع تھے اور کسی بیمہ ایجنٹ کا بیمہ ایجنٹ کی حیثیت سے، اس محفل میں شریک ہونا خارج از بحث تھا۔ پھر فن میں رجعت

اور ترقی، مردنی اور زندگی کی جو بحثیں چلیں، ان میں غفور نے صرف بڑھ چڑھ کر ہی حصّہ نہیں لیا کہ یہ کام تو بعض جہلا بھی خاصے سلیقے سے کر لیتے ہیں، اس کی باتوں میں وزن بھی تھا اور معلوم ہوتا تھا، کہ وُہ فن کی باریکیوں اور نزاکتوں سے ناآشنا نہیں ہے، البتہ غفور کی شخصیت نے مجھے ایک لحاظ سے ضرور چونکایا، اور محفل سے اُٹھ آنے کے بعد بھی یہی سوچتا رہا کہ اس کا لباس کتنا بے شکن تھا، مگر اس کے چہرے پر کتنی شکنیں تھیں۔ آنکھوں اور ہونٹوں کے گوشوں کے پاس پھیلی ہوئی شکنیں، سوئیوں ایسی باریک باریک شکنیں جن میں سے کچھ اس کے باتیں کرنے سے اور کچھ باتیں نہ کرنے سے پیدا ہوتی تھیں۔

مگر یہ کچھ ایسی شدید قسم کی سوچیں نہ تھیں کہ میرے ذہن پہ مُسلط ہو جاتیں۔ پھر مجھے وہ جاننے والے یاد آ گئے۔ جن کے لباس تو شکنوں سے پُر ہوتے تھے، مگر ان کے چہروں پر تندرستی کے فانوس جلتے رہتے تھے۔ جسم اور لباس کے درمیان یہ خلیج کہاں حائل نہیں ہوتی۔ بہترین لباسوں میں کیسے کیسے منحنی پیکر چھپے رہتے ہیں اور کیسے کیسے ترشے ہوئے جسم، بے ڈھنگے، ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں، رائیگاں چلے جاتے ہیں۔

غفور سے میری دوسری مُلاقات سال ڈیڑھ سال بعد ہوئی۔ وہ ایک بارونق سڑک کے کنارے، ایک ہجوم میں کھڑا مداری کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اس پر محض اس لئے پڑ گئی کہ وہ اپنے لباس کی وجہ سے سارے ہجوم سے الگ معلوم ہو رہا تھا۔ پہلے مجھے شبہ سا ہوا کہ یہ غفور ہے۔ قریب جا کر دیکھا، تو وہی بے شکن لباس اور وہی شکنوں سے بھرا ہوا چہرہ۔ البتہ اب شکنوں کی سوئیاں سلائیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا تو ایک ثانیے کے لئے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر جیسے جھپٹا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ہجوم سے الگ لے آیا۔ میں نے پوچھا، ”آج کل کیا مشاغل ہیں؟“

ہنس کر بولا ”یہی، مداریوں کے تماشے دیکھتا ہوں!“

میں نے کہا ”اور وہ بیمہ ایجنسی کیا ہوئی؟“

”بیمہ ایجنسی؟“ اُس نے پوچھا ”ہاں، وہ بیمہ ایجنسی۔“ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ پھر مسکرا کر بولا ”پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ یعنی یہ پیشہ میں نے ان لوگوں کے سپُرد کر دیا جو اسی پیشے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے تو اب وہاں —— کیا کہتے ہیں —— خانیوال میں ایک ہوٹل کھول رکھا ہے، اور اللہ کا بڑا کرم ہے۔“

پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور یہ باتیں اس نے یوں بے تکلّفی سے کھُل کر کیں کہ مجھے بھی تکلّف سے قطع نظر کرنے میں کوئی ایسی جھجک نہ ہوئی۔ میں نے کہا۔

”اس روز آپ سے پہلی مُلاقات کے بعد میں ایک عجیب سوچ میں پڑ گیا تھا۔ نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ اس لئے آپ سے اپنی مشکل حل کرانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اب دُوسری مُلاقات ہوئی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے پچھلے سال ڈیڑھ سال کا عرصہ اکٹھے گذارا ہے۔ سوچوں ہی سوچوں میں انسان ایک دوسرے کے کتنے قریب آ جاتے ہیں۔“

”واقعی!“ وہ بولا ”اب آپ ملے ہیں تو میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے ساتھ یہ میری دوسری مُلاقات ہے۔ مگر وہ آپ کی مشکل کیا تھی؟“

میں نے کہا ”پہلے میں اپنی بے تکلّفی کی معافی مانگ لوں۔“

مُسکرا کر بولا ”دے دی معافی۔ اب فرمایئے۔“

میں نے کہا ”یہ بتایئے کہ آپ کا لباس کتنا بے شکن ہے، مگر آپ کے چہرے پر اتنی بہت سی شکنیں کیوں ہیں؟“

اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے وہ سنجیدہ ہوتے ہوتے رہ گیا اور جیسے ہنسی پہ ضبط کرتے ہوئے بولا: "اس لئے کہ میں سوٹ کو اپنے بستر پہ لٹا دیتا ہوں اور خود سوٹ کیس میں بند ہو جاتا ہوں۔"

ہم دونوں ذرا دیر ہنستے رہے۔ پھر وہ بولا: "اگر میں یہ کہوں کہ یہ فکر کی تسکین ہے تو یہ نہ سمجھئے گا کہ میں اپنے آپ کو مُفکّر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فکر کرنے کا حق صرف مفکروں کو حاصل نہیں ہے۔ ایک کسان بھی اس بات پہ غور و فکر کر سکتا ہے کہ کل شام سے پہلے، جب اتنی بہت سی ابابیلیں آسمان پہ اڑتی پھر رہی تھیں اور 'میں پیاسی ہوں، میں پیاسی ہوں' کی فریادیں کر رہی تھیں تو بادل کیوں نہ اُمڈے اور بارش کیوں نہ ہوئی۔ کسان کے نزدیک تو یہ قدرت کا قانون ہے کہ جب ابابیل صاف آسمان کے پس منظر میں روئے گی تو مینہ برسے گا۔ ہے نا یہ بات؟"

"جی!" میں نے اعتراف کیا۔ حالانکہ موسمی پیش گوئی کے اس طریقے سے میں بالکل بے خبر تھا۔

"سامنے ریستوران میں کیوں نہ جا بیٹھیں۔" اس نے تجویز پیش کی۔ "آپ کو اس وقت کوئی ضروری کام تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں!" میں نے کہا۔ "ہوتا بھی تو ملتوی ہو سکتا تھا۔ آپ سے مُلاقات روز روز تھوڑی ہوتی ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا، مجھے ہاتھ سے پکڑا، اور عجیب ریستوران میں لے آیا، جس کی چوڑائی تو باہر اس کی پیشانی پہ لگے ہوئے بورڈ کے برابر تھی، مگر لمبائی دُور مدھم روشنی میں ڈوبتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ شرقاً غرباً کنواں کھدا ہوا ہے۔ تمام کُرسیاں خالی پڑی تھیں۔ مگر تمباکو کی بُو سے یہ

ریستوران لبالب بھرا ہوا تھا۔ دُور دو بیرے دیوار کے ساتھ یوں لگے کھڑے تھے، جیسے چھوڑ دو تو لڑھک جائیں گے۔

اس کنوئیں کے پاتال میں جا کر وہ ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا: "میں کہہ رہا تھا کہ بس میں سوچتا رہتا ہوں۔ اب میں کھڑا بظاہر مداری کا تماشا دیکھ رہا تھا مگر اصل میں سوچ رہا تھا کہ یہ جو اُس نے اپنی گُدّی پر گھونسہ مار کر منہ سے لوہے کا اتنا بڑا گولا برآمد کیا ہے اور اتنے بہت سے دو دھارے بلیڈ نکالے ہیں تو وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور اسی انسان کو اکنی دونی کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے اور پھر ——" وہ یکایک رُک گیا اور جیسے چونک کر کھڑا ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا: "اس سوچ بچار کی وجہ سے ذہن کا یہ عالم ہو رہا ہے کہ میں جو کوئی دس پندرہ منٹ تک مداری کا تماشا دیکھتا رہا ہوں، اسے کچھ دیئے بغیر یہاں ریستوران میں آ بیٹھا ہوں۔ بعض اوقات ہمدردی کے جوش میں ہم سے کیسی کیسی غیر ہمدردانہ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ ایک منٹ کی اجازت دیجئے۔ میں مداری کو اس کا معاوضہ دے آؤں۔" دو قدم چل کر وہ رُکا اور بولا۔ "معاوضے کے لفظ پہ غور کیا آپ نے؟ خود مداری بھی اسے خیرات ہی کہے گا، مگر میں اسے معاوضہ کہنے پر مُصر ہوں۔"

غفور کے کردار کا یہ رُخ مجھے بہت پیارا لگا۔ میں اسے عجیب ریستوران کے کنوئیں میں سے نکلتا ہوا دیکھتا رہا۔ کاؤنٹر کے پاس پہنچ کر اس نے منیجر سے کوئی بات کی اور پھر باہر نکل گیا۔ فوراً واپس آ کر بولا۔ "چائے نہیں آئی ابھی تک؟"

"آ جائے گی۔" میں نے کہا۔

اُس وقت ایک بیرا چائے لے آیا اور دوسرے نے سینڈوچ، پیٹی، کیک، پیسٹری اور بسکٹ سے بھری ہوئی ڈشوں کا ایک طشت لا کر رکھ دیا۔ میں نے اس انبار

سے بوکھلا کر کچھ کہنا چاہا، مگر اُس نے جیسے میری نیت بھانپ لی اور بولا "آپ کو یہ ریستوراں عجیب سا لگ رہا ہو گا۔"

"جی نہیں۔" میں نے کہا "بس یہ ہے کہ چوڑائی ذرا کم ہے۔"

"یوں کہیے کہ لمبائی ذرا زیادہ ہے۔" وہ ہنسا "میں نے ایک دن اس کے مینجر سے پوچھا تھا کہ تمہارے ریستوران کے جغرافیے کو کیا ہو گیا ہے؟ بولا "یہ میری قبر ہے، جو مجھ سے حساب کتاب لینے سمٹتی آ رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟"

"اچھا ہے!" وہ بولا "خاصا ہے، ملتان کے ایک مشہور چوک، حسین آگاہی میں ہے۔"

میں نے پوچھا "تو کیا ملتان میں بھی ہے آپ کا ہوٹل؟"

"جی ہاں!" وہ تیزی سے بولنے لگا "وہاں سے ——— وہ کیا کہتے ہیں ——— خانیوال سے بسم اللہ کی۔ کام چل نکلا تو ایک شاخ ملتان میں کھول دی۔ اب سوچ رہا ہوں، بہاولپور میں بھی کسی مناسب جگہ کا انتظام کر لوں۔ کاروبار پھیلے تو پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔" بے اختیار ایک قہقہہ مار کر بولا "اور سکڑے تو عجیب ریستوران بن جاتا ہے" ——— چائے کا ایک گھونٹ پی کر وہ پھر بولنے لگا "مگر مجھے یہ ریستوران پسند ہے۔ مجھے یہ بڑا پُراسرار سا لگتا ہے۔ بالکل الف لیلہ کا سا۔ میں یہاں گھنٹوں آنکھیں بند کر کے جادو کے غالیچے پر بیٹھا اُڑتا رہا ہوں۔ ایسا سکون ہے یہاں کہ سگریٹ کا کش لگا کر دُھواں چھوڑیئے تو وہ اوپر نہیں جاتا۔ آپ کے آس پاس دیر تک مکڑی کا جالا سا بنا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں سوچیے تو بڑا مزا آتا ہے۔ کچھ بھی سوچیے، یہی سوچ لیجئے کہ یہ جو سامنے بیرا کھڑا ہے تو یہ صرف بیرا نہیں ہے، ایک ماں کا بیٹا، ایک بیوی کا شوہر، ایک بہن کا بھائی اور ایک بیٹی کا باپ بھی ہے۔

پھر وہ اس مُلک کا شہری بھی ہے۔ پھر وُہ اس انسانی برادری کا ایک رُکن بھی ہے، جو عموماً کام لے لیتی ہے مگر دام نہیں دیتی۔ تو یہ صرف بیرا نہیں ہے، کہ آپ کے سامنے چائے لا کر رکھے گا اور اس کا فرض پُورا ہو جائے گا۔ نہیں ——— اسے ماں کی دوا بھی لانی ہے، بیوی کا جوتا بھی خریدنا ہے، بہن کے لئے ٹالپس اور بیٹی کے لئے گڑیا کا انتظام بھی کرنا ہے۔ پھر اس کی رشتہ داریاں ہوں گی، دوستیاں ہوں گی، تمنائیں ہوں گی، یہ رویا ہو گا، اُس نے ٹوٹتی راتوں کو دُعائیں مانگی ہوں گی۔ اللہ! اب کے میری لاٹری نکل آئے۔ اللہ آج صبح گھر سے نکلوں تو سو سو کے نوٹوں سے پھولا ہوا بٹوا مجھے سڑک پر پڑا مل جائے ——— آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے کہا، اور میں نے ٹھیک کہا۔

یکایک زرد قمقموں کے دُھندلے اُجالے میں، مجھے غفور کے چہرے کی شکنیں خراشیں بنتی نظر آئیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مروڑنے کی حد تک سہلا رہا تھا۔

"بس یہی کمزوری ہے میری۔" اس کی آواز بھی بدلی ہوئی سی تھی "آپ ہی بتایئے، ایسی سوچوں سے چہرے پر شکنیں نہیں پیدا ہوں گی تو کیا گلاب کھلیں گے؟ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرے چہرے کی یہ شکنیں میری نہیں ہیں، پرائی ہیں۔ اس لیے کہ یہ پرائی سوچوں نے پیدا کی ہیں۔ اپنے بارے میں تو میں نے بہت کم سوچا ہے۔ اوّل تو دوسروں کی سوچوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر اپنے بارے میں سوچنے کی کوئی ایسی گنجائش بھی نہیں ہے، اللہ کا دیا ہوا بہت ہے اور عام فارغ البال آدمی، زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتا ہے کہ دُور جہاں سمندروں کے ساحلوں پر ناریل کے درخت چھاتے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور مچھیرنیں اپنے مچھیروں کی واپسی کے لئے ناچ ناچ کر اور گا گا کر، اپنے معبودوں کی پُوجا کرتی ہیں، وہاں وہ سفری لباس پہنے، ایک غیر ملکی سیّاح کی حیثیت سے جا نکلے اور مچھیروں کے

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تکمیل میرے بس میں نہیں ہے۔ پُورے معاشرے کے بس میں نہیں ہے تو میرے چہرے پر ایک اور شکن اُبھر آتی ہے اور میری عُمر کے پیڑ کی ایک اور ٹہنی، ٹوٹ جاتی ہے۔"

وہ چائے کا ایک گھونٹ پینے کے لیے رُکا، تو میں فوراً بولا "معاف کیجئے میرا مطلب وہ نہیں تھا جو آپ سمجھے۔"

چائے پیے بغیر اُس نے پیالی رکھ دی اور بولا "اگر آپ کا مطلب وہ نہیں تھا جو میں سمجھا تو یوں سمجھئے کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ آپ سے نہیں کہا، عام دُنیا سے کہا ہے۔ دُنیا عموماً یہی سمجھتی ہے کہ میرے چہرے کی شکنیں میری اپنی ہیں۔ پرسوں میں۔ وہاں سے —— کیا کہتے ہیں —— ملتان سے لاہور آ رہا تھا کہ ٹرین میں ایک خاصی پکّی عُمر کے جوان نے مجھ سے کہا "چاچا جی! ذرا سا ادھر ہو جائیے" میں ذرا سا ادھر ہو گیا، مگر اس سے پُوچھا "بھتیجا جی! آپ کے خیال میں میری عمر کیا ہو گی؟" وہ بولا "یہی کوئی پینتالیس پچاس" میں نے کہا، "اور اگر بتیس چونتیس ہو تو کیا آپ چاچا جی کا خطاب واپس لے لیں گے؟" وہ گھبرا کر مجھے گھورنے لگا جیسے پوچھ رہا ہے کہ "اگر یہ بات ہے تو پھر یہ کیا بلا ہے؟" میں اس کی مشکل کو سمجھ گیا۔ اس لئے ہنس دیا۔ وہ بھی کھسیا کر ہنسنے لگا، اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر میں لاہور تک یہ ضرور سوچتا رہا کہ یہ نوجوان میرے ان تمام مہربانوں کا نمائندہ ہے جو مجھے نہیں دیکھتے میری شکنوں کو دیکھتے ہیں ——" پھر وہ زور سے ہنس کر بولا "آپ بھی تو ابھی ابھی ان مہربانوں میں شامل ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔"

"نہیں نہیں" میں نے اپنی بات دُہرائی "میرا یہ مطلب نہیں تھا"

اُس نے مُسکرا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور کچھ دیر تک یونہی

بیٹوں، بیٹیوں کے ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے سکے رکھ کر اور ان میں بسکٹ اور ٹافیاں بانٹ کر، اپنے احساسِ برتری کے غبارے میں ہَوا بھرتا پھرے۔ خُدا کا شکر ہے، کہ میں ان فارغ البالوں میں سے نہیں ہوں۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے وہ جان بوجھ کر رُک گیا ہے اور مجھے اس وقت کچھ نہ کچھ ضرور بولنا چاہیئے، سو میں نے یونہی کہہ دیا "لیکن جب آپ دوسروں کے بارے میں سوچتے ہیں، تو دراصل اپنے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔"

میرا مقصد اس کی تعریف تھا۔ مگر اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی "دیکھئے، یہاں سے باتوں کا رُخ نفسیات کی طرف مُڑ جائے گا اور جدید علم نفسیات سے مجھے ایک بڑی شکایت ہے۔ جب اس سے کوئی بات نہیں بنتی تو وہ بات رکھنے کے لئے کوئی بات گھڑ لیتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے پیار کرتا ہے تو یہ علم کہتا ہے کہ اس بیچارے کو ماں کا پیار نصیب نہیں ہوا۔ جب کوئی آدمی اپنے ملک کی آن پر قربان ہو جاتا ہے تو یہ علم کہتا ہے کہ جنسی زندگی میں پے در پے شکستوں کے بعد اس کے سامنے صرف یہی راہ فرار تھی۔ یہ علم اگر عام ہو جائے تو مذہب، اخلاق اور تہذیب کی دُنیا خالی ڈھنڈار ہو کر رہ جائے۔ نیکی، ہمدردی اور بدی جبلّت بن جائے۔ آپ کہتے ہیں، میں دوسروں کے بارے میں سوچتا ہوں تو دراصل اپنے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں براہِ راست اپنے بارے میں سوچنے سے گھبراتا ہوں۔ مگر میں کیوں گھبراؤں؟ اگر آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ میری جنسی، گھریلو، مُعاشی اور معاشرتی زندگی سب ایسی تصویریں ہیں جو اتنی مکمل ہیں کہ اگر خود مصوّر بھی چاہے تو ان میں ایک ذرا سے خم، ایک ننھے سے نقطے کا بھی اضافہ نہ کر سکے۔ میں جب دوسروں کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی طرح دوسروں کی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہوں مگر جب

بیٹھا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اتنی دیر ہو جائے گی۔ اس لئے بہت سے ضروری کام ایکدم یاد آ گئے تھے۔ میں فوراً جانا چاہتا تھا۔ مگر اس ڈر کے مارے کہ کہیں وہ اس سے بھی کوئی دُوسرا مفہوم اخذ نہ کرے، چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

یکایک وہ بولا۔" میں نے بھی میزبانی کی انتہا کر دی۔ سارا وقت آپ کو باتوں میں لگائے رکھا اور آپ کو صرف ایک ——— بلکہ ایک کیا، آدھا سینڈوچ کھانے کی مُہلت دی۔ لاحول وَلاقوۃ۔"

"اور خود آپ نے چائے کی ایک پیالی بھی پُوری نہیں پی۔" میں نے کہا۔

"دیکھئے" وہ بڑی منّت سے بولا۔" میری خاطر تھوڑا سا کچھ کھا لیجئے۔ میں بھی عجیب بونق آدمی ہوں۔"

میرا سچ مچ جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے بولا۔" اصل میں ایک سینڈوچ میں نے یہاں کھایا ہے، ایک اور سینڈوچ ایک ٹی پارٹی میں جا کر کھانا ہے۔ دوپہر کے بعد کی چائے پر میں اس سے زیادہ چاہُوں بھی تو نہیں کھا سکتا۔"

"تو آپ کسی پارٹی میں جا رہے تھے؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔" مگر آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، مجھے آپ نے نہیں روکا ہے۔ میں خُود رُکا ہوں، اور ابھی بہت وقت ہے، پہنچ جاؤں گا۔"

وہ مجھ سے پہلے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھ سے متواتر کئی معافیاں مانگیں۔ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ کاؤنٹر کے قریب سے بھی گزر گیا۔ دروازے کے پاس رُک کر میں نے کہا۔" مگر وہ بِل بھی تو ادا کرنا تھا۔"

بولا۔" فکر نہ کیجئے۔ یہاں میرا حساب چلتا ہے۔" باہر نکل کر وہ ہنسنے لگا۔" میں یہاں نہیں ہوتا تو کئی دوست آ کر یہاں میرے حساب میں چائے پی جاتے ہیں اور میں جب واپس آ کر بِل ادا کرتا ہوں تو ایسا لُطف آتا ہے، ایسا لُطف آتا ہے کہ کیا عرض

کروں۔"

میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، تو اُس نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر بولا۔" میں کچھ دنوں کے لئے ادھر وہ ——— وہ ——— ملتان جا رہا ہوں۔ آؤں گا تو ضرور ملاقات ہو گی۔ چار پانچ مہینے بعد آپ کا ادھر سے گزر ہو تو یہیں ریستوران سے پوچھ لیجئے گا!"

"ضرور!" میں نے کہا۔" خدا حافظ!"

"خُدا حافظ!" وہ بولا اور ریستوران میں داخل ہو گیا۔

میں اس کے بعد تجیب ریستوران کے سامنے سے دو بار گزرا، مگر دونوں بار کچھ ایسی تیزی میں تھا کہ غفور کے بارے میں نہ پُوچھ سکا۔ پھر دوسری ملاقات پر اس کی باتیں اور سوچیں مجھ پر یُوں چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی تھیں کہ میں اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا بھی تھا۔ دراصل بعض لوگوں کی شخصیتیں کچھ ایسی ہمہ گیر قسم کی ہوتی ہیں کہ ان کی چار دیواری میں انسان بالکل دُبک کر رہ جاتا ہے اور میں اس روز غفور کی شخصیت کے خول میں بالکل سمٹ کر رہ گیا تھا۔

یہ کوئی سات آٹھ مہینے بعد کی بات ہے جب میں شام سے کچھ دیر پہلے تجیب ریستوران کے سامنے سے تیسری بار گزرا۔ میں شاید یونہی نکلا چلا جاتا۔ مگر جب میں نے ریستوران کے دروازے کی طرف دیکھا تو مجھے گمان سا ہُوا کہ وہاں آخری سیڑھی پر بازو پہ بازو چڑھائے اور دائیں بائیں ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے غفور کھڑا ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس نے سُوٹ کی بجائے دھاری دار پاجامہ اور ڈھیلی ڈھالی سی شیروانی پہن رکھّی تھی۔ اتنی ڈھیلی کہ اس میں غفور کا جسم مجھے گھڑیال میں لٹکتی ہوئی آہنی زبان کی طرح جھولتا محسوس ہُوا۔

میں اس کی طرف بڑھا تو جب بھی اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ البتّہ جب میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو وہ چونکا۔ آخری سیڑھی پر سے کُود کر مجھ سے لپٹ گیا۔ پھر بولا۔ "کیا آپ یقین کریں گے کہ مَیں یہاں کھڑا کئی گھنٹوں سے آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا؟"

اس کے دعوے سے اختلاف کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس لئے میں نے بات میں پیچ ڈال کر کہا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج میرا ادھر سے گزر ہوگا؟"

وہ بولا۔ "سوکھے ٹھنڈھ درخت کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ بہار آرہی ہے اور بہار کے استقبال کے لئے اس میں کونپلیں کیوں پھُوٹنے لگتی ہیں؟ پیش بینی کی قوّت کس میں نہیں ہوتی؟ "کُتّے" تک بھونچال سے گھنٹوں پہلے رونے لگتے ہیں۔"

غیر محسوس قوتوں کے سامنے منطق کو ہتھیار ڈال دینا پڑتے ہیں۔ اس لئے میں نے موضوع بدل کر کہا۔ "سُنایئے مزاج کیسے ہیں؟"

بولا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ کل شام ہی کوئٹہ سے آرہا ہوں، اور آج صبح ہی سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ کچھ ایسے اعتماد کے ساتھ، جیسے میں نے آپ کو اپنی آمد کی اِطلاع دے رکھی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کوئٹے کس سلسلے میں جانا ہوا؟ اس سے پہلے تو آپ خانیوال اور مُلتان میں تھے۔"

اُس نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "وہ کٹ پیس کا کاروبار میرے بس کی بات نہیں تھی، اِس لئے بھاگ آیا۔"

میں نے کہا۔ "مگر آپ نے تو وہاں ہوٹل کھول رکھے تھے۔"

اُس نے فوراً ایک اور قہقہہ لگایا۔ "اچھا تو یہ کٹ پیس کا قصّہ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ ہوٹل تو میں نے یہاں سے واپس جاتے ہی بیچ ڈالے تھے۔ یہ اتنا پھیلا ہوا کام ہوتا ہے کہ اکیلا آدمی بالکل پاگل ہو کر رہ جاتا ہے۔ سو اس کے بعد میں پنڈی چلا گیا اور وہاں کٹ پیس کا کاروبار شروع کر دیا۔ پھر جب دیکھا کہ اس ٹنٹے میں میرا دماغ بھی کٹ پیس بنا جا رہا ہے تو مَیں نے اُدھر کوئٹے کی طرف جا کر ایک ایسا کاروبار شروع کر دیا کہ۔۔۔۔" ذرا سا رُک کر بولا۔ "اس کی تفصیل یہاں نہیں بتاؤں گا۔ چلئے اندر چل کر بیٹھیں۔ آپ کو کوئی ضروری کام تو نہیں ہے؟" پھر مُسکرا کر بولا۔ "کسی ٹی پارٹی وغیرہ میں تو نہیں جانا ہے آپ کو؟"

مَیں نے کہا۔ "بڑی تیز یادداشت ہے آپ کی۔"

چہرے پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ شکنیں یُونہی تو نہیں لئے پھرتا ہوں۔"

میں نے اس مُلاقات میں، پہلی بار اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا، اور مجھے محسوس ہوا کہ جو شکنیں چند مہینے پہلے ایک دُوسرے کے متوازی چلتی تھیں، اب ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی ہیں اور اس کی جلد بالکل چارخانہ ہو رہی ہے۔ ان شکنوں نے مجھے فوراً شاید اس لئے متوجہ نہیں کیا تھا کہ اس سے پہلے اس کے چہرے کی شکنوں اور لباس کی بے شکنی کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا تھا۔ اور بے ربطی نظروں کو حُسن و توازن سے بھی زیادہ تیزی سے جکڑ لیتی ہے۔ مگر آج اُس کے چہرے کی شکنیں جیسے اس کی گردن پر سے اُتر کر اس کی شیروانی میں سرایت کر گئی تھیں۔ مَیں نے اسے پہلی بار شیروانی میں دیکھا تھا۔ مگر شیروانی سے زیادہ عجیب چیز اس شیروانی کا بے ڈھنگا پن تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے مٹکے میں سے نکال کر لایا ہے۔

"آپ حیران کیوں کھڑے ہیں؟" وہ بولا۔ "میں نکلا تھا اس شیروانی کو استری کرانے مگر پھر سوچا کب تک اسے بازو پر اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔ سو پہن لی۔ مگر آپ کے انتظار میں استری کرانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بھئی خُدا کی قسم مجھے آپ کا انتظار تھا۔"

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبایا۔

ہم عجیب ریستوران کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر، پرلے کونے میں اسی پرانی میز پر جا بیٹھے۔ میز پر ایک گلاس رکھا تھا جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔ غفور نے گلاس اُٹھایا اور پانی پی کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "پانی جھوٹا تھا شاید۔"

"جی ہاں!" وہ بولا "جھوٹا تھا۔ مگر میرا ہی جھوٹا تھا۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھا ہوں نا!"

بیرے کو چائے کا آرڈر دے کر وہ آہستہ سے بولا "اب بتاؤں؟"

میں نے کہا "جی ہاں جی ہاں! تو وہ کون سا خفیہ کاروبار ہے جس کا ذکر صرف اس گوشے میں ہو سکتا ہے۔"

"سمگلنگ!" وہ بولا۔

جیسے اُس نے گلاس اُٹھا کر میرے منہ پر دے مارا۔

"سمگلنگ؟" میں نے پوچھا "یعنی آپ سمگلر ہیں؟"

میں نے گھبرا کر اپنے سگرٹ کیس سے ایک سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔

"اگر میں یہ کہوں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولنے لگا "اگر میں یہ کہوں کہ میں سمگلنگ کی کاروباری مشین کا ایک پرزہ ہوں تو شاید میں غلط بیانی نہیں کروں گا۔"

مجھے خاموش پا کر وہ پھر بولا "اور اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ آپ بھی اسی مشین کے ایک پرزے ہیں تو یہ بھی غلط بیانی نہیں ہوگی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے حیران ہو کر احتجاج کیا "سمگلنگ سے مجھے نفرت ہے۔ میں اس پیشے پر تھوکتا ہوں۔"

وہ فوراً بولا "اور یہی تھوکی ہوئی چیز آپ کی زندگی کے قریب قریب ہر شعبے

میں رچی ہوئی ہے۔"

میں نے دبے دبے غصے سے پوچھا "کیا آپ اس ارشاد کی وضاحت فرمائیں گے؟"

وہ بولا "دیکھئے، یہ سگرٹ جو آپ پی رہے ہیں سمگل کیا ہوا ہے۔ اس کی درآمد ہمارے ملک میں ممنوع ہے، مگر اس کی رسائی آپ کے صرف ہاتھوں تک نہیں" آپ کے پھیپھڑوں تک ہے۔ کون جانے آپ نے غیر ملکی کپڑے کا جو سوٹ پہن رکھا ہے وہ کراچی کی بندرگاہ پر اُترا تھا اور اس پر کسٹم ادا کیا گیا تھا، یا یہ ساحلِ مکران کی طرف سے اونٹوں پہ لد کر سندھ کے کسی شہر میں پہنچا اور۔۔۔"

"اس طرح تو ہمارے ہاں کا بچہ بچہ سمگلنگ کی مشین کا پرزہ ہوا۔" میں نے طنزاً کہا۔

مگر وہ جیسے فاتحانہ شان سے بولا "تو میں نے شروع میں یہی تو عرض کیا تھا۔"

"پھر ——؟" میں نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں بھی کچھ ایسا ہی سمگلر ہوں۔"

"یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ایک بات ہے۔" وہ بولا "بات یہ ہے کہ آپ جو مال خرید کر سمگلنگ کرتے ہیں، میں وہی مال بیچ کر سمگلنگ کرتا ہوں۔ دیکھئے۔ میں آپ کو سمجھاؤں۔ سرحد پار سے مال سمگل کرنے والے بھی اور ہیں اور شہروں تک پہنچانے والے بھی اور ہیں۔ میں اس مال کا صرف خریدار ہوں۔ میں اسے خرید کر بیچ دیتا ہوں۔ آپ اسے خرید کر استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے میں آپ سے بھی ذرا کم درجے کا سمگلر ہوں۔"

اب کے ہم دونوں نے ایک ساتھ زور کا قہقہہ لگایا اور ابتدائی گفتگو کی کوفت کچھ کم ہو گئی۔

بیرا چائے لایا تو طشت میں چائے، چینی اور دودھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ بیرے کو ملامت کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"کیا تمہارے دماغ میں اتنی ذرا سی بات بھی نہیں آئی کہ میں جو ایک معزز مہمان کو باہر سے پکڑ کر لایا ہوں تو اسے صرف کھولتے ہوئے پانی پر نہیں ٹرخاؤں گا بلکہ۔۔"

"جی نہیں!" میں نے فوراً تکلف برتا۔ "میں صرف چائے پیوں گا۔ شام کا وقت ہے۔ اس وقت کچھ کھا لیا تو کھانا کیسے کھایا جائے گا؟"

غفور مسکرا کر بولا۔ "کیا آج کسی ڈنر میں جانے کا ارادہ ہے؟"

"جی نہیں!" میں نے کہا۔ "آخر گھر میں بھی تو انسان کھاتا ہی ہے۔"

"تو آج میرے ساتھ کھا لیجئے گا۔"

"کھا لوں گا۔" میں نے ڈر کر حامی بھر لی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بیرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے۔" بیرا چلا گیا تو بالکل میرے کان کے پاس مُنہ لا کر بولا۔ "کوٹ دیکھا تھا اس بیرے کا؟"

"جی نہیں!" میں نے کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا۔"

مسکرا کر بولا۔ "شارک سکن کا کوٹ پہنے ہوئے ہے کم بخت۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا، تو نجیب ریستوران کی آدھی رات کے ماتھے پر بیرے کا کوٹ چاند کی طرح چمکتا نظر آیا۔ پھر جب میں نے حیران ہو کر غفور کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"سمگلنگ کا مال ہے۔ مجھ سے خریدا ہے اور بھلا بتائیے تو کتنے میں خریدا ہوگا۔ نہیں آپ نہیں بتا سکیں گے۔ کُل پانچ روپے میں۔"

"حد ہے" میں نے کہا۔ "تو کیا آپ سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کا کاروبار کرتے ہیں؟"

"فرسٹ کلاس سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ایران کے بڑے بڑے افسروں اور جاگیرداروں کے کپڑوں کا۔ میرا اڈہ کوئٹہ ہے۔ بڑے سمگلر یہ کپڑے ایران سے بلوچستان میں لاتے ہیں۔ ان سے چھوٹے اُنہیں کوئٹے لے آتے ہیں، اور وہاں سے ہم ننھے مُنّے سمگلر انہیں کراچی، لاہور اور راولپنڈی، پشاور تک پہنچاتے ہیں، مگر سچّی بات ہے میں ضمیر کو تھپک نہیں رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مال کوئٹے کے بازار میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی غیر قانونی حیثیت کی "غیر" گھس چکی ہوتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "اب میں ایک پورا ویگن بُک کر کے پنڈی جا رہا تھا تو سوچا، ایک دانہ آپ کی نذر کرتا جاؤں۔"

"دانہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ بولا۔ "ایک کوٹ ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو یوں لگا، جیسے درزی کی دُکان سے سیدھا سمگلر کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ بالکل برینڈ نیا۔ آپ اسے پسند کریں گے، پیش کروں؟"

"اس وقت کہاں جائیے گا؟" میں نے کہا۔

"جانا وانا کہیں نہیں ہے۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "یہیں رکھا ہے، اسی لئے تو مجھے آپ کا انتظار تھا۔"

وہ منیجر کے پاس گیا۔ وہاں سے اخبار میں لپٹا ہوا ایک بنڈل اُٹھا کر لایا۔ پھر مجھے ساتھ والی ایک کیبن میں لے گیا۔ بنڈل کر کوٹ دکھایا۔ جس کا کپڑا واقعی نہایت اچھا تھا۔ اور پُرانے پن کے بھی کہیں آثار نہ تھے۔ میں نے کوٹ پہنا تو وہ بولا۔ کہیں آپ نے تہران کے اس درزی کو اپنا ناپ تو نہیں بھجوا دیا تھا؟"

کوٹ واقعی میرے بالکل فٹ تھا۔ "اس کے بدلے میں کیا نذر کروں؟"

وہ میرے کندھے کو تھپتھپا کر بولا "دُعا اور محبت"۔

میں نے کہا "نہیں، دُعا اور محبت اپنی جگہ پر، مگر جہاں معاملہ کاروبار کا ہو وہاں یہ قصے نہیں چلنے چاہئیں۔ اگر آپ مجھے یہ کوٹ دے رہے ہیں تو آپ کو اس کی قیمت لینا ہو گی۔"

"بہت اچھا" اُس نے بے انتہا سنجیدہ صُورت بنا کر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ "لائیے دس روپے لائیے۔"

"صرف دس روپے؟" مَیں نے پھر احتجاج کیا۔

"تو کیا سو روپے؟" وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا "ارے صاحب جب وُہ شارک سکن کا کوٹ پانچ روپے میں جا سکتا ہے تو اس کے تو دس روپے لے کر مَیں آپ کو لُوٹ رہا ہُوں۔"

مَیں نے دس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ تو مَیں نے محسوس کیا کہ اُس کا پھیلا ہوا ہاتھ کانپ رہا ہے۔

"آپ کانپ کیوں رہے ہیں؟" مَیں نے بھدے پن سے کہہ ڈالا۔

"لائیے بھی!" اُس نے جیسے غصّے میں نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور کیبن سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر تک میں کیبن میں ہکا بکا کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ باہر جا کر میں غفُور کا سامنا کیسے کروں گا۔ میں نے اس کے تحفے کی قیمت ادا کر کے اس کے خلوص کو جیسے نیلام پر چڑھا دیا تھا۔

پردہ اُٹھا کر جھانکا تو میز خالی تھی اور بیرا برتن سمیٹ رہا تھا۔

"غفور صاحب کہاں ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"وہ تو چلے گئے۔" بیرا بولا۔ وُہ مجھے کیبن میں سے نکلتا دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔

میں نے کیبن میں سے اپنا پُرانا کوٹ اُٹھایا اور بیرے سے بِل لانے کو کہا۔ بیرا بولا "یہاں تو صاحب، غفور صاحب کا حساب چلتا ہے۔ ان کا حکم ہے کہ جب وہ کسی کے ساتھ چائے پئیں تو بل انہی کے نام ہو گا۔ ہم ان کے دوستوں سے بل وصول نہیں کرتے۔"

مَیں ریستوران سے باہر آ گیا۔ شام اندھیری ہو چکی تھی اور سڑک پر موٹر کاروں کی روشنیوں کے فوارے چھُوٹ رہے تھے۔

پٹڑی پر آ کر مَیں ایک طرف چلنے لگا۔ میرے سینے کی کیفیت، شرابی کے کوٹ کی اس جیب کی سی ہو رہی تھی، جس میں چھُپی ہوئی بوتل ہجوم کے دباؤ سے ٹوٹ چکی ہو اور اس کی کرچیاں ایک دوسرے کو کاٹ رہی ہوں اور بج رہی ہوں۔ ایسا محسُوس ہوتا تھا۔ جیسے میں گھر جا کر آئینہ دیکھوں گا تو مجھے معلوم ہو گا کہ غفور کے چہرے کی تمام شکنیں میرے چہرے پر منتقل ہو چکی ہیں۔

چلتے چلتے مَیں نے اپنے پُرانے کوٹ کی اندرونی جیب سے بٹوہ نکال کر نئے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالنا چاہا تو میرے قدم رُک گئے اس جیب میں کاغذ کے چند پُرزے تھے۔ بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے جا کر میں نے اُن پرزوں کو دیکھا۔ اکثر پر بعض لوگوں کے پتے لکھے تھے۔ چند پُرزوں پر غالبؔ اور نظیریؔ وغیرہ کے اشعار درج تھے۔ ایک پُرزے پر چھوٹے چھوٹے سَودوں کا حساب لکھا تھا۔

یہ پُرزے جیب میں ڈال کر، مَیں بڑی تیزی سے واپس نجیب ریستوران میں آیا، منیجر نے مجھے ذرا چونک کر دیکھا اور بولا "فرمائیے!"

میں نے کہا "کیا آپ مجھے غفور صاحب کے گھر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

"یہیں کہیں آس پاس ہی رہتے ہیں" وہ بولا۔ پھر اُس نے شارک سکن کے کوٹ والے بیرے کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا اور اس سے کہا "صاحب کو

غفور صاحب کے گھر کا پتہ چاہیئے۔"

بیرے نے مجھے بتایا کہ اسی ریستوران کی عقبی گلی کے آخری سرے پر ایک میدان ہے جس میں بہت سی بھینسیں بندھی ہوئی ملیں گی۔ اس میدان کے مغرب میں کوارٹروں کی ایک قطار ہے۔ اسی کے نمبر ۹ میں غفور صاحب رہتے ہیں۔

یہ عقبی گلی بالکل تاریک تھی، اس لئے جب میں میدان میں پہنچ گیا تو جب بھی یُوں سیدھا چلتا رہا، جیسے گلی ابھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر میں ایک بھینس سے نہ ٹکرا جاتا تو شاید یونہی ناک کی سیدھ میں چلتا رہتا۔ ایک گوالے نے میری رہنمائی کی اور مجھے اُن کوارٹروں کے پاس چھوڑ آیا۔

مجھے نو نمبر کوارٹر ڈھونڈنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ گوالے نے مجھے جہاں چھوڑا تھا، وہیں میرے کانوں میں غفور کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا "تو اب میں اور کیا کرتا۔ اس سے زیادہ تو کوئی بے حیا سے بے حیا آدمی بھی نہیں کر سکتا۔"

پھر ایک خاتون کی بھیگی بھیگی آواز سُنائی دی "پچاس روپے کی پتلون تم نے پانچ ٹھیکریوں میں دے ڈالی۔ اب ایک سو کا کوٹ دس روپلی میں غارت کر آتے ہو تو بتاؤ میں لاہور سے کراچی جاؤں گی تو تمہارے یہ پندرہ روپے کیا مجھے روہڑی سکھر سے ادھر ہی نہیں چھوڑ دیں گے؟"

میں لپک کر کوارٹر کے دروازے پر آ گیا جس پر بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔

غفور بولا "کیا تم چاہتی ہو کہ میں انارکلی میں جا کر پھیری والوں کی طرح کوٹ اُٹھائے گھومتا پھرتا۔ میری دوڑ میرے دوستوں تک تھی اور دوستوں کے ساتھ سودے نہیں ہوتے۔ تم کیا جانو۔ میں نے اُن سے یہ پندرہ روپے لے کر اپنے دل کے پندرہ ٹکڑے کر لئے ہیں۔"

خاتون خاصی بلند آواز میں روتی ہوئی بولی "اور وہاں کراچی میں جانے میری اماں

دم توڑ رہی ہوں گی یا دم توڑ چکی ہوں گی۔"

جواب میں غفور کچھ نہیں بولا۔ وہ شاید بیوی کا سر اپنے سینے سے لگائے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا یا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبائے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ کوٹ اُتارا، پہلے جی چاہا، غفور کو پکاروں، کوٹ اس کے حوالے کر دوں اور اسے دلاسہ دوں۔ مگر موجودہ صورتِ حال میں غفور کے لئے دلاسے سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی تھی؟

پھر سوچا پردہ اٹھا کر کوٹ اندر پھینکوں اور بھاگ جاؤں۔ مگر یہ اس سے بھی بھونڈا طرزِ عمل تھا۔

اور غفور اور اس کی بیوی کی باتوں کے بعد اس کوارٹر پر جو سناٹا مسلط ہو گیا تھا، وہ مجھے روندے ڈال رہا تھا۔

یکایک مجھے کوارٹروں کی قطار کے پرلے سرے پر ایک آدمی نظر آیا۔ میں اس کی طرف بھاگا تو وہ رُک گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا "آپ انہی کوارٹروں میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں!" وہ بولا۔ اُس نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی جس میں اس کے چہرے کا صرف ایک حصہ جھلک رہا تھا۔

"آپ غفور صاحب کو جانتے ہیں؟" میں نے دوسرا سوال پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ بولا "کیا وہ اپنے کوارٹر میں نہیں ہے؟"

میں تیزی سے بولنے لگا۔ "دیکھئے میں بہت دیر سے ان کا کوارٹر ڈھونڈ رہا ہوں، اور مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔ اگر اب غفور صاحب سے ملاقات ہو گئی تو وہ تکلف میں پڑ جائیں گے، اور مجھے دیر ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ کل وُہ میرے ہاں یہ کوٹ بھول کر چلے آئے۔ بس یہ کوٹ ان تک پہنچانا ہے۔"

اُس نے مجھ سے کوٹ لے لیا اور ہنستے ہوئے بولا "دے دوں گا، ابھی دے دیتا ہوں۔ میں خود حیران تھا کہ آج غفور کو میری پھٹی پُرانی شیروانی مانگنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟ اب معلوم ہُوا کہ حضرت اپنا کوٹ ہی گنواتے پھرتے ہیں۔ عجیب بھُول بھلکڑ آدمی ہے۔"

نصیب

رضیہ کی جوانی تو جیسے اپنے ابّا کی موت کے انتظار میں تھی۔ کم سے کم اس کی ماں کو تو ایسا ہی محسوس ہُوا۔ ماتم سے فارغ ہونے کے بعد جب ماں بیٹی نے بڑے کمرے کی دری لپیٹی اور اس کے حاشیے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف بیبیوں کی تھوکوں کے داغ دھونے بیٹھیں، تو یکایک رضیہ بیگم اپنی بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔

اس وقت رضیہ نے ہفتے بھر کے چیکٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔ لٹھے کی شلوار کے پائنچے بالکل سیاہ ہو رہے تھے۔ جمپر کا دامن صافی کی طرح میلا تھا اور بالوں نے اُجڑ کر مانگ کو غائب کر دیا تھا۔ وہ ایک دھجّی کو بھگو بھگو کر دری کے حاشیے پر رگڑ رہی تھی۔ ہر رگڑ کے ساتھ اس کی آستین کہنی تک ہٹ جاتی تھی۔ اور میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا صندل چمک چمک جاتا تھا۔ رضیہ بیگم کو سب سے پہلے انہی سڈول بازوؤں نے رضیہ کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی پرلے کونے میں بھیگی ہوئی دھجّی لئے بیٹھی تھی۔ جب پہلی بار رضیہ کے بازو کا کوندا لپکا، وہ ذرا سی چونکی اور پھر رضیہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے نئے سرے سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

اچھّا تو رضیہ بیٹی یہ تم ہو! ——— یہ ہو تم ——— تمہاری جھُکی ہوئی لانبی آنکھوں کے گوشوں میں سے یہ جگنو سے کیسے جھانک رہے ہیں! تمہارے بال ایک دم اتنے

کیوں بڑھ آئے ہیں کہ فرش کو چھُو رہے ہیں! یہ کیسے ننھے ننھے بھنور ہیں جو تمہارے گالوں میں بن بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔ تمہارا جسم یوں بھرا بھرا سا کیوں لگتا ہے جیسے تم نے جمپر پہننے کے بجائے مڑھ رکھا ہے، اور بیٹی تمہاری جلد چمک کیوں رہی ہے! چمک نہیں رہی، تو تمہارے جمپر کے پیچھے یہ آگ سی کیسی جل رہی ہے! ٹھیک ہے، اب تم سترہ سال کی ہو رہی ہو، اور پڑوس میں سترہ سال کی عروسہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے، مگر بیٹی! ابھی کل تک تو تم گڑیاں کھیل رہی تھیں اور ابھی تو ہم تمہارے رشتے کے بارے میں یوں رودارودی میں سوچتے تھے، جیسے ابھی کیا ہے۔ ابھی تو چار برس پڑے ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ اس سے پہلے مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ایسی جلدی کیا ہے! پر بیٹی اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر مہینے دو مہینے کے اندر تمہارے ہاتھ پیلے نہ ہوئے تو اپنی ہی آگ میں جھلس جاؤ گے، یہ ایکایکی تمہیں کیا ہو گیا رضیہ بیٹی! —— لیکن جب باپ کی موت بیٹی کی جوانی کا انتظار نہیں کرتی تو بیٹی کی جوانی کو باپ کی موت کیوں روکے؟ اور پھر جوانی اپنی مرضی کی چیز تو نہیں ہے۔ جوانی تو آجاتی ہے، یہ تو ٹوٹ پڑتی ہے جوانی کو بہرحال آنا ہے جیسے گندم کی بالی کو پک کر آخر کار، بہرحال سنہری ہونا ہے شوہر کی موت کی طرح بیٹی کی جوانی بھی بیوہ کا نصیب ہے۔

"میرے نصیب!" رئیسہ بیگم ماتھے پر چٹاخ سے ہاتھ مار کر اُبل اُبل کر رونے لگی، اور رضیہ دھجّی کو پھینک کر ماں کی طرف لپکی۔ روتی ہوئی بیٹی نے روتی ہوئی ماں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور پُکار پکار کر کہنے لگی "مت روئیے امی۔ اس طرح تو آپ کی بینائی بھی آنسوؤں میں بہہ جائے گی امی۔"

روتی ہوئی ماں جیسے سوچ میں پڑ گئی، بیٹی کے بازو کتنے لمبے تھے کہ انہوں نے پوری ماں کا احاطہ کر لیا تھا۔ بیٹی کے جسم میں کتنی گرمی تھی اور اس کی سانسوں میں کیسی شعلے کی سی لپٹ تھی۔ ماں نے بیٹی کو ذرا دیر کے لئے یوں غور سے دیکھا، جیسے پوچھ رہی

ہے۔ "بیٹی تم اب تک کہاں تھیں؟"

مانا کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں کے ذہن میں رشتوں کی گرہیں بندھنے کھلنے لگتی ہیں اور رئیسہ بیگم نے بھی رضیہ کے لئے رشتوں کا ایک پورا دستہ تیار کر رکھا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اب تک وہ سہج سہج چل رہی تھی۔ شوہر کے بازو کا سہارا لے کر، سہج سہج چلنے ہی میں مزا آتا ہے۔ وہ سوچتی تھی۔ حامد برا نہیں ہے۔ مگر چار سو کی تنخواہ بھی کوئی تنخواہ ہے، چار سو میں تو رضیہ کا ایک جوڑا بھی نہیں آئے گا۔ شکورا بڑا وجیہہ جوان ہے مگر صرف وجاہت کوئی کہاں تک بیٹھا چاٹے۔ اور پھر رضیہ کیا کم وجیہہ ہے! دُنیا بھر میں اس کی سی آنکھیں کوئی دکھا دے تو اللہ قسم! اپنی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دوں۔ "روسو" رضیہ کے ابا کہا کرتے تھے "یہ تمہاری بیٹی اپنی آنکھیں کہاں سے لائی ہے؟ میری آنکھیں تو ماشاء اللہ ہیں تمہاری آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ اِلّا ماشاء اللہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ رضو کی آنکھیں!" اور پھر رضیہ نے تو ابھی ایف اے ہی پاس کیا تھا۔ بی اے تک پہنچے گی تو رشتے آپ ہی آپ، زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑا کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہونے لگیں گے۔

اور اب رئیسہ بیگم نے شہر کے ان سب لڑکوں کی ماؤں کے قدموں میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑا کر ڈھیر ہو جانا شروع کیا جو رضیہ کے ابا کی زندگی میں رئیسہ بیگم کے ذہن میں بھرتی کے امیدواروں کی طرح صف باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مگر کسی نے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ رضیہ کی طبیعت کیسی ہے۔ سب نے رئیسہ بیگم کو بیوہ کی حیثیت سے دیکھا۔ یہ کسی نے نہ دیکھا کہ بیوائیں مائیں بھی ہوتی ہیں اور مائیں اپنی بیٹیوں کے رشتوں کی ڈالیاں سجا کر نہیں پھرا کرتیں۔ یہ کام تو بیٹوں کی ماؤں کا ہوتا ہے اور یہاں تو بیٹوں ڈالیوں کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے رئیسہ بیگم کے شوہر کے ساتھ اس کی بیٹی بھی مر گئی ہے۔

"ہاں بہن رئیسہ بیگم"، سب کہتیں "اسی لئے تو بڑی بوڑھیاں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی

تھیں کہ اے اللہ میاں۔ ہمیں اس جہان سے ہمارے سرتاج سے پہلے اُٹھا لیجو۔ ہمیں وُہ پھُول نہ بننے دیجو۔ جس کے گرد بلبلیں نہیں منڈلاتیں بلکہ جن پر چڑیاں بیٹیں کر جاتی ہیں۔"

ہر گھر سے وُہ یہ کہتی ہوئی اُٹھی "اب چلوں بہناں۔ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر میں رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔"

صرف ایک گھر میں اُس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔

"ارے بیٹھو بھی رئیسہ بیگم، کہاں چلیں؟ ایسی بھی کیا جلدی جیسے یہ بتانے آئی ہو کہ ہم جا رہے ہیں۔"

رئیسہ بیگم نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے کہا "بس چلوں بہناں۔ وہاں اس ویرانے میں جسے کبھی "فرحت کدہ" کہتے تھے، میری رضیہ بیٹی گھبرا رہی ہوگی۔"

"اری ہاں وہ رضیہ بیٹی" بانو بولی "اللہ رکھے وہ تو اب پوری سیانی ہو گی میں نے تو یہی کوئی سال بھر پہلے اسے شرف النساء کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کی بیٹی کی شادی پر۔ سب لوگ مایوں بیٹھی ہوئی عطیہ کو چھیڑ رہے تھے۔ جب رضیہ بیٹی دروازے پر نمودار ہوئی، اور اللہ قسم رئیسہ بیگم، خوشامد کی بات نہیں، سارا کمرہ یوں سنسنا کر رہ گیا کہ بس، تکتے رہ گئے سب کے سب۔ رضیہ بھی گھبرائی کہ یہ ایکا ایکی سب کو کیا ہو گیا۔ اس معصومہ کو کیا خبر کہ ہم سب اللہ کی قدرت دیکھ رہے ہیں اور حیران ہو رہے ہیں کہ اچھا تو ایسی صورتیں بھی ہوتی ہیں کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ پلک تک نہ جھپک سکو۔ جھپکو تو سمجھو کوئی گناہ کیا ہے، خدا نصیب کرے۔ کیسی ہے وہ؟ ابا کی موت نے تو اسے نچوڑ لیا ہوگا!"

گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھتی ہوئی رئیسہ بیگم، اب آہستہ آہستہ بیٹھ چکی تھی۔ بولی "موم کی مریم ہو رہی ہے میری جان۔"

"اب تو اس کی ساری فکریں تمہی کو کرنا ہوں گی۔" بانو بولی۔

"ہاں بہناں، اور کون ہے اس کا۔" رئیسہ بیگم اب پھسکڑا مار کر بیٹھ چکی تھی۔ "بس صرف اتنا سا کام باقی ہے کہ بات کہیں طے پا جائے۔ جہیز تو اس کا دو برس پہلے سے تیار رکھا ہے۔ آدھی درجن نیکلیسوں سے لے کر افشاں اور سیندور تک۔ بس اتنا سا ہے کہ کہیں نصیب جاگیں۔"

"نصیبوں نے تو اس زمانے میں بھنگ پی رکھی ہے بہن۔" ———— بانو بولی۔ "یہ ہمارے پڑوس میں عاطفہ کو دیکھو، باپ کی اتنی بڑی دُکان ہے کہ چاہو تو تانگے سمیت اندر چلی جاؤ۔ پر پانچ سال تک ماں باپ کان دھرے بیٹھے رہے کہ دروازے پر کوئی دستک دے تو اُٹھیں۔ جب کوئی راستہ بھول کر بھی نہ آیا تو بیٹی کو اُٹھا کر ایک اسکول ماسٹر کے پلے باندھ دیا اور اب اس کے گھروندے میں بڑی جڑواں بچے پیدا کر رہی ہے۔"

"وہ لڑکی تو صورت کی بھی اچھی تھی۔" رئیسہ بیگم ڈر کے مارے بول دی کہ کہیں بات ختم نہ ہو جائے۔

"صرف اچھی؟" بانو نے کہا۔ "اچھی خاصی تھی۔"

"تو پھر تم نے اپنے انور کے لئے کیوں نہ پُوچھا؟" رئیسہ بیگم نے ٹوہ لگانا چاہی۔ اُلٹا بانو اس کی بات کی ٹوہ تک پہنچ گئی اور ادھیڑ پن کے باوجود مٹک کر بولی۔ "اس نے تو درجن لڑکیوں میں سے ایک کو چُن بھی لیا ہے۔ اس کے ابا حج سے واپس آ جائیں تو شاید اگلے چاند کی چودھویں تک . . . ."

"مُبارک ہو" کے الفاظ رئیسہ بیگم نے "تف ہو" کے لہجے میں ادا کئے اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر اُٹھ کھڑی ہوئی "اللہ کا شکر ہے۔ اللہ پھولے پھلے۔"

"آمین۔" بانو بولی۔ "بس چلیں؟"

"ہاں بہناں چلوں۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!" رئیسہ بیگم نے کہا اور رستے بھر سوچتی آئی کہ ٹھیک ہی تو کہا ہے بانو نے، سچ مچ اب ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔

برآمدے میں رضیہ پرانا البم کھولے بیٹھی تھی۔ "امی" اس نے کہا۔ "یہ جو لاہور والی خالہ زلیخا ہیں۔ جو آپ سے لپٹی ہوئی کھڑی ہیں۔ یہ اچھی سہیلی ہیں آپ کی کہ ہمارے ابا کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے ہمدردی کا ایک کارڈ بھی نہ لکھا۔"

"تو ہم نے کہاں لکھا تھا اُسے۔" رئیسہ بیگم بولی، اور پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ "اُسے پتہ چلتا تو خط کیا لکھتی خود پہنچتی۔ خود نہ آ سکتی تو اپنے سلیم کو بھیج دیتی۔ پر اُسے کوئی بتاتا بھی تو۔"

"اکبر ماموں نے لاہور میں سب کو تو بتایا تھا۔" رضیہ بولی۔ "اس روز کہہ نہیں رہے تھے کہ ادھر انہیں تار ملا، ادھر وہ کار لے کر سب جاننے والوں کے ہاں اطلاع دے آئے۔"

"زلیخا کا نام نہیں لیا تھا اُس نے۔" رئیسہ بیگم بولی۔ "میں نے سب کے نام پوچھے تھے مگر زلیخا کا نام کہیں نہیں آیا۔"

"آپ نے بھی تو یاد نہ دلایا۔" رضیہ نے کہا۔

"ہاں میرے اُجڑے ذہن سے بھی اُتر گیا۔ برسوں ہو گئے دیکھے ہوئے۔ اس وقت سلیم کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ایف اے میں پڑھتا تھا۔ اب ایم اے میں تو ضرور ہو گا۔"

. . . . ذرا سا رُک کر بولی۔ "بیٹی ذرا کاغذ قلم تو اٹھا لاؤ۔ اکبر کو لکھ دوں کہ وہ زلیخا کو جا کر بتائے۔ میں تو زلیخا کا پتہ ہی بھول گئی ہوں۔"

خط لکھ کر اُس نے برقعہ اوڑھا اور گلی کے نکڑ پہ لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

تیسرے روز دستک ہوئی۔ رضیہ نے دروازہ کھولا، تو وہیں سے چلائی ——

"اے امی، یہ تو اکبر ماموں ہیں۔" پھر وہ ماموں کو پیچھے چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آئی اور کمرے میں جھانک کر بولی۔ "اکبر ماموں آئے ہیں امی۔"

مگر رئیسہ بیگم نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ بڑے سکون سے بولی۔ "ہاں ہاں۔ آئے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے ہی تو بلایا تھا۔"

"کیوں بلایا تھا؟" اکبر کمرے میں آ کر بولا۔ "بلایا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی تو لکھ دیتیں کہ کیوں بلا رہی ہو۔ اب تم دونوں کو جیتا جاگتا دیکھ کر جان میں جان آئی ہے۔ ورنہ جانے کیسے کیسے بھیانک نقشے آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ یہ "فوراً پہنچو" کے الفاظ لکھنے تو الفاظ ہیں مگر اصل میں پستول کی گولیاں ہیں۔ اِسے کے کلیجہ ہلا دیا، گھر بھر کا۔ تو یہ ہے۔" وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"بلایا ہے تو یونہی تو نہیں بلایا ہے۔" رئیسہ بیگم بولی۔ "کوئی بات ہے جو بلایا ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اب تمہیں نہیں بلاؤں گی تو اور کسے بلاؤں گی؟"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کب کہتا ہوں، پر باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں ویسے سب خیریت ہے۔"

"تو پھر ادھر آؤ۔ دونوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تو تم لوگوں سے ملا ہی نہیں۔" ذرا دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اکبر نے پوچھا۔ "بھئی باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ مجھے بلایا کیوں تھا۔ تم نے تو سولی پر لٹکا رکھا ہے مجھے۔"

"بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔" رئیسہ بیگم نے رضیہ کی طرف کچھ اس طرح دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے امی نے اسے کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا ہے۔

"تم کہاں چلیں رضو؟" اکبر نے پوچھا۔

"ماموں جان، میں ذرا اُدھر . . . ."

"جانے دو۔" رئیسہ بیگم فوراً بول اُٹھی۔ "جاؤ بیٹی تم ماموں کے لئے چائے تیار کرو۔" رضیہ چلی گئی تو اس نے اکبر سے کہا۔ "دیکھو اکبر۔ رضیہ کے ابا کے مرنے کے بعد مجھے

دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو رضیہ کے لئے بیاہ کا انتظام کرنا ہے اور دوسرے اپنی موت کا انتظار کرنا ہے۔"

"باجی۔۔۔۔"

"سنو تو۔ مجھ ایسی نگوڑی بیوائیں جن کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، یہی تو کرتی ہیں اور کیا کرتی ہیں اور کر بھی کیا سکتی ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ رضیہ کے رشتے کا انتظام کرنا ہے جلدی سے۔ اتنی دیر نہ لگے کہ بیٹی ماں سے اس کی طبیعت کا حال بھی پوچھے تو ایسا لگے جیسے اپنے بیاہ کی یاد دہانی کرا رہی ہے۔"

"یہ تم مجھے بتا رہی ہو باجی؟" اکبر نے بہن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں بھی تو رخسانہ اور دردانہ کا باپ ہوں اور وہ تو رضیہ سے پانچ پانچ سات سات سال بڑی ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بڑا مشکل ہے مجھے دیکھو، لاہور میں رہتا ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار ہے۔ بنگلہ ہے موٹر ہے۔ سب کچھ ہے۔ مگر داماد نہیں ہے۔ سب کہتے ہیں لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔"

"پر رضیہ نے تو ایف اے پاس کر لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے پر وہ سیالکوٹ میں رہتی ہے نا۔ لاہور۔ کراچی میں ہوتی تو ایک دن بھی نہ لگتا۔"

"تو میں لاہور میں اُٹھ آؤں؟ میں تو اس کام کے لئے دُنیا کے آخری کنارے تک جانے کو تیار ہوں۔"

"آجاؤ۔" اکبر نے کہا۔

"سنو۔" رئیسہ بیگم کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ "ایک رشتہ ہے۔"

"کہاں؟" اکبر دم بخود سا رہ گیا۔

"لاہور میں!"

"لاہور میں؟" اکبر نے یوں پُوچھا جیسے لاہور میں رِشتے کی موجودگی ناممکنات میں شامل ہے۔

"ہاں ہاں۔ میری وہ سہیلی ہے نا۔ تم تو اسے جانتے ہو، زلیخا۔"

"ہاں جانتا ہوں۔"

"اس کا بیٹا سلیم۔" رئیسہ بیگم نے مُسکرا کر کہا۔

"ارے ہاں۔۔۔۔ ہاں۔" اکبر بھی ذرا سا مُسکرایا۔

اب رئیسہ بیگم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ بولنے لگی "کچھ اتنے امیر بھی نہیں ہیں کہ نخرے کرنے لگیں۔ سیدھا سادا درمیانہ گھرانہ ہے۔ پھر زلیخا کے ساتھ میرا اتنا پُرانا تعلق ہے کہ مجال ہے جو وہ انکار کر جائے۔ تمہیں اس لئے بُلایا ہے کہ میں کہاں اس بڑھاپے میں ماری ماری پھروں گی۔ اگر تمہارے ساتھ چلی بھی جاؤں تو رضیہ کو اکیلے کیسے چھوڑوں اسے بھی لے جاؤں تو یہ باتیں کیسے سنوں کہ رشتے کی خاطر بیٹی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہے۔ نمائش کے لئے۔ سو تم یوں کرو کہ واپس جا کر اسٹیشن سے سیدھے زلیخا کے گھر پہنچو اور اس سے سیدھی بات کر دو۔ کہہ دو رئیسہ نے یونہی کہا تھا۔"

"یہی بات، باجی، تم خط میں بھی تو لکھ سکتی تھیں۔" اکبر نے شکایت کی۔

"نہیں، اکبر پیارے۔ ایسی باتیں خطوں میں لکھنے کے زمانے گزر گئے۔ آج کل ڈاک کا کیا اعتبار۔ غلطی سے یہ خط اڑوس پڑوس والوں کے ہاتھ لگ جائے، تو اشتہار بنا پھرے۔" لمحہ بھر خاموشی رہی۔ پھر رئیسہ بیگم بولی "پھر اب کیا ارادہ ہے؟" اکبر بولا "ٹھیک ہے۔ جاتا ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی مناسب بات ہے۔"

چائے پی کر اکبر واپس چلا گیا۔ اور ادھر رات گئے تک ماں بیٹی ایک دُوسرے

سے یوں جھینپی جھینپی پھرتی رہیں جیسے کوئی بات کریں گی تو کچھ ٹوٹ ٹاٹ جائے گا۔

"جاگ رہی ہو میری رضو؟" آخر رئیسہ بیگم نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔

"ہاں امی!" رضیہ بولی۔ "پڑھ رہی ہوں۔"

"میں آج بہت خوش ہوں۔" رئیسہ بیگم نے راز فاش کیا۔

"شکر ہے!" رضیہ بولی۔

پھر خاموشی چھا گئی کیونکہ رئیسہ بیگم کو بات آگے بڑھانے کے لئے کوئی نئی بات نہ سُوجھی اور رضیہ بات آگے بڑھانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اسی کیفیت میں ایک دن گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ایک مہینہ گزر گیا اور آخر ایک روز رئیسہ بیگم نے اکبر کے نام ایک لمبا خط لکھا۔ برقعہ اوڑھا اور گلی کے نکڑ پر لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

تین چار دن کے بعد ڈاکیئے نے دستک دی، رضیہ دروازے کی طرف لپکی، اور خط لاکر ماں کے حوالے کر دیا۔

"اکبر کا معلوم ہوتا ہے!" رئیسہ بیگم نے کہا۔

"ہاں!" رضیہ بولی۔ "انہی کا لگتا ہے۔"

رئیسہ بیگم کچھ دیر تک لفافے کو اُلٹتی پلٹتی رہی، جیسے سوچ رہی ہے کہ کس طرف سے چاک کروں اور اگر چاک کر لوں تو کہیں خط اپنی عبارت بولنے نہ لگے۔

رضیہ چپکے سے کمرے میں سے نکل آئی۔

رئیسہ بیگم اسے جاتا دیکھ کر مسکرائی۔ لفافہ چاک کیا۔ آدھا خط پڑھنے تک یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چمٹی رہی۔ پھر یکایک چراغ کی طرح بُجھ گئی۔ پھر وُہ ایک غیر انسانی چیخ مار کر وحشیوں کی طرح کمرے سے باہر نکلی۔ ادھر سے رضیہ دوڑی آئی اور رئیسہ بیگم نے خط کو اس کے ہاتھ میں ٹھونس کر پُوری قوت سے کہا۔ "اسے پڑھو۔ اُونچا اُونچا پڑھ کر

سناؤ۔ سارے محلّے کو سناؤ، ساری دُنیا کو سناؤ۔"

"امی!" رضیہ نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔

مگر رئیسہ بیگم نے رضیہ کو اپنے آپ سے جیسے نوچ کر الگ کر دیا اور اُسے ڈپٹ کر بولی۔ "پڑھو!"

رضیہ ہولے ہولے پڑھنے لگی۔ اس کے اکبر ماموں نے اپنی "پیاری باجی" کو اطلاع دی تھی کہ ایک عجیب اتفاق ہو گیا۔ "میں تمہیں خط لکھتا تو کیسے لکھتا۔ ہوا یہ کہ میں زلیخا بہن سے ابھی اِدھر اُدھر کی باتیں ہی کر رہا تھا کہ اُس نے پھٹ سے اپنے سلیم کے لئے میری رُخسانہ کا رشتہ پُوچھ لیا۔ اَب میں حیران کہ کیا کروں۔ پھر سوچا کہ رُخسانہ بھی تو تمہاری بیٹی ہے۔ اور پھر رضیہ سے سات سال بڑی ہے، آج رُخسانہ کے نصیب جاگے ہیں، تو کل رضیہ کے بھی ضرور جاگیں گے۔ سو بات وہیں طے پا گئی۔ ۱۵ رجب نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ تم ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ جانا۔ رضیہ کو بھی ساتھ لیتی آنا۔ یہاں دو تین لڑکے میری نظر میں ہیں ——— دُعا کا طالب اکبر۔"

ہمم بیگ

وہ تھا تو منحنی سا آدمی، مگر وُہ بہت بڑا آدمی تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو آدمی کروڑوں اور اربوں روپے کا مالک ہے اور جس کے سامنے ملکی حکومت کے علاوہ ملحقہ ملکوں کی حکومتیں بھی آنکھیں جھکائے دوزانو بیٹھی رہتی ہیں، وہ اتنی خفیف سی مخلوق کیوں ہے کہ ہتھیلی پر رکھ کر پھونک مارو تو فضا ہی میں معلّق رہ جائے اور زمین کی کشش ثقل کم سے کم پانچ منٹ کے لئے تو ضرور ناکام ہو جائے۔ کہتے ہیں چیونٹی اس کے پاؤں کے نیچے آ کر بھی چلتی رہتی تھی۔

یہ سب تو خیر مبالغے کی باتیں ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ بڑا آدمی بہت چھوٹا سا تھا۔ کسی نہایت دُور اندیش اور جہاندیدہ سیکرٹری نے اسے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لینے کا مشورہ دیا تھا، ورنہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو اس کے بڑھاپے میں بھی اجنبی لوگ اسے "برخوردار" کہہ بیٹھتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مونچھ اس کے جسم کا ایک حصّہ معلوم نہیں ہوتی تھی وہ پٹھانوں کے کندھے پر رکھی ہوئی چادر کی طرح بالکل فالتو چیز تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ اسے چھینک آئی تو مونچھیں پھرکی کی طرح چکرا کر گر پڑیں گی۔ لیکن مونچھوں نے اس کی شخصیت کا بھرم ضرور رکھ لیا تھا۔ بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر اگر لپ اسٹک بُری معلوم ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ بڑھیا کے اس اطمینان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے کہ لوگوں کی نظریں اس کے ہونٹوں کی

سیاہی تک نہیں پہنچ سکتیں۔

اس بڑے آدمی نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ چونتیس برس کے تو معمولی معمولی بڑے آدمی بھی ایک چھوڑ دو دو تین تین شادیاں کر چکے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بہت بڑا آدمی اپنے ملک اور پڑوسی ملکوں میں اپنے کارخانوں، دکانوں، بنکوں، بیمہ کمپنیوں، فارموں اور زمینوں کے انتظام میں کچھ یوں ڈوبا رہتا تھا کہ اپنی ماں کے سوا کسی عورت کو پہچانتا ہی نہ تھا۔ بڑی بڑی ضیافتوں میں بھی وہ عورتوں کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھتا تھا، جیسے ہوٹل میں بیٹھا بیرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لوگ اس سے اپنی بیویوں کے سہارے اپنی بیٹیوں کا تعارف کراتے تو وہ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" کے الفاظ یوں ادا کرتا جیسے کہہ رہا ہے "آپ ان کی بیٹی ہوتی ہیں تو ہوتی پھریں۔ بس ٹھیک ہے۔ ہو گیا تعارف۔ اب ذرا ایک طرف ہٹ جائیے اور میرا رستہ چھوڑ دیجئے۔"

"شادی تو بیٹا، ایک روز کرنا ہی ہوگی۔" بیگم بہرام ہر دوسرے تیسرے مہینے یاد دہانی کا فرض ادا کرتیں۔

اور ہمم بیگ غصّے میں آ کر ہمیشہ یہی کہتا "آخر ضرورت ہی کیا ہے؟"

بیگم بہرام آنے والے دو تین مہینے شادی کی ضرورت کو مہذب الفاظ کا لباس پہنانے کی کوشش میں گزار دیتیں۔ مگر جب بیٹے سے بات کرتیں تو ان کی ساری سوچیں "وہ تو کرنا ہی ہوگا بیٹا۔" میں سمٹ آتیں اور ظاہر ہے کہ اس تجویز کا جواب ہمم بیگ کے ہاں موجود تھا۔

پھر یکایک مملکت میں افواہ پھیل گئی کہ ہمم بیگ کی شادی کے لئے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ یہ تاثر دراصل یوں پیدا ہوا کہ اپنے چچازاد بھائی سے ہمم بیگ کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی اور جب شام کو وہ دفتر سے گھر آیا اور ماں کو سارا حال سُنایا تو وُہ بولی "اگر تم نے شادی نہ کی بیٹا، تو یہی کمینے تمہارے وارث ہوں گے۔"

بیگم بہرام کے ذہن میں یہ بات پہلے بھی ہزار بار آئی تھی۔ مگر اسے معلوم تھا کہ یہ بیمہ ایجنٹ کا سا طرزِ استدلال ہے، اس سے موت کا پہلو نکلتا ہے اور ہمم بیگ اگر دُنیا میں کسی طاقت سے ڈرتا تھا تو وہ صرف موت تھی۔

آج بیگم بہرام کی زبان سے یہ بات بغیر کسی پیشگی تیاری کے نکل گئی اور ہمم بیگ جو شادی کے ذکر کے بعد غصّے میں شام کا کھانا تک نہیں کھاتا تھا، اس روز ماں کی بات سنتے ہی جیسے سناٹے میں آگیا۔

اس وقت بغل کے کمرے میں کوئی خادمہ موجود تھی۔ اُس نے ہمم بیگ کی یہ حالت دیکھی تو وُہ بھی سناٹے میں آگئی۔ آج شادی کے ذکر پہ ہمم بیگ نے نہ تو شادی کی ضرورت کے بارے میں کچھ پُوچھا تھا، نہ اُس نے بچوں کی طرح پاؤں پٹخے تھے اور نہ اس نے ٹوٹے ٹوٹے نفقروں میں ماں سے کوئی احتجاج کیا تھا۔ "آخر ضرورت ہی کیا ہے؟" وہ طیش میں آکر بچوں کی طرح منمناتے ہوئے ماں سے احتجاج کرتا تھا۔ "کہہ جو دیا کہ ہم نہیں کریں گے شادی۔ ہم کیوں کریں شادی؟ ہمیں ضرورت ہی کیا ہے شادی کی؟" وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج جیسے ہمم بیگ کی زبان پتھرا گئی تھی، اور وہ فرش سے ماں اور ماں سے فرش کو دیکھتا ہوا ننھے ننھے قدم اُٹھاتا دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جہاں سے خادمہ تیسرے کمرے میں چلی آئی تھی۔

خادمہ نے یہ بات باورچی تک پہنچائی تو وہ بھی سناٹے میں آگیا۔ پھر وہ مسکرانے لگا اور یکایک مٹھیاں بھینچ کر ہیڈ باورچی کی طرف بھاگا۔

ہیڈ باورچی پر بھی سناٹے کا ایک مختصر سا دور گزرا، اور پھر جب وہ صبح کو بازار گیا تو شام تک شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا کئی بار آ، اور جا چکا تھا۔

بیگم بہرام کے بدلے بدلے تیوروں نے بھی اس افواہ کے ہاتھ مضبوط کئے۔

اب وہ بڑی بڑی ضیافتوں میں جوان لڑکیوں کو غنڈوں کی طرح گھورتی تھی اور جب اس

کی ہم عمر بیگمات اس سے پوچھتی تھیں کہ "بیگم بہرام کس سوچ میں مگن ہیں؟" تو وہ جواب دیتی تھی "اپنا فرض پُورا کر رہی ہوں۔"

اب ہمم بیگ کے دفتروں میں ٹائپسٹ لڑکیاں تک اس سے شرمانے لگی تھیں، اور وہ اس کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ انہی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

بیگم بہرام اب بیٹے کے ساتھ خاصی بے خوفی سے شادی کا ذکر کرنے لگی تھی۔ لیکن جس طرح پچھلے دس بارہ برس میں اسے "کرنا ہی ہوگی" کا جواب "ضروری ہی کیا ہے؟" سے ملتا تھا۔ اسی طرح ہمم بیگ اب اس کی ہر تاکید کے جواب میں صرف اتنا کہتا "یہ تو اماں تمہارا کام ہے۔ میرا کام نہیں۔"

اور بیگم بہرام دو تین مہینے کے لئے اسی سوچ میں ڈوب جاتی کہ ہمم بیگ کو کس طرح مہذب طریقے سے سمجھایا جائے کہ یہ دراصل اسی کا کام ہے۔

تھوڑے سے عرصے کے بعد ہمم بیگ کی دُلہن کی یہ تلاش اخباروں کے ہتھے چڑھ گئی وہاں سے نکل کر غیر ممالک میں جا پہنچی۔ "مونچھوں والے کروڑپتی" کی سُرخیوں سے ہمم بیگ کی بڑی بڑی تصویریں چھپیں۔ اس کی زندگی کے حالات اور اُس کی امارت کے اندازے شائع ہوئے، اور ایک اخبار نے تو یہ خبر بھی درج کر دی کہ مونچھوں والا کروڑپتی اپنی رفیقۂ حیات کی جستجو میں عنقریب قاہرہ اور پیرس کے شبانہ کلبوں میں، ہالی وُوڈ کے نگارخانوں اور مس یونیورس اور مس ورلڈ کے انتخابی مقابلے کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنے کے لئے اپنے ہی طیارہ میں ساری دُنیا کا سفر اختیار کرنے والا ہے۔

انہی دنوں ہمم بیگ نے ایک ملحقہ مملکت میں اپنے وسیع کاروبار کے معائنے کا پروگرام بنایا۔ اس مملکت کی حکومت شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا تھی۔ اس لئے جب اسے ہمم بیگ کے اس ارادے کا علم ہوا تو فوراً ایک دعوت داغ دی اور ایک

بہت بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار کا یہ نجی دورہ شاہانہ حیثیت اختیار کر گیا۔

بیگم بہرام نے پڑوسی ملک کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے بیٹے کے خوب خوب کان بھرے۔ اسے بتایا کہ بہرام بیگ مرحوم نے بھی اس کے ساتھ صرف اس لئے شادی کی تھی کہ اس کی آنکھیں اس پڑوسی ملک کی لڑکیوں کی آنکھوں کی طرح سیاہ تھیں "اور پھر بیٹا!" بیگم بہرام نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "طبیعت کی ایسی حلیم کہ بالکل بھیڑیں، اور آواز میں ایسی لطافت جیسے رباب کے تاروں پر بوندیں گر رہی ہوں۔ میرا دل مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میری بہو یہاں نہیں ہے وہاں ہے۔"

"کہاں؟" ہم بیگ نے پوچھا۔

اور بیگم بہرام اُداس ہو گئی۔ پھر فوراً سنبھل کر بولی "وہیں بیٹا جہاں تم جا رہے ہو۔"

"مگر اماں" ہم بیگ نے کہا "یہ میرا کام نہیں ہے، تمہارا کام ہے۔"

"لو پھر وہی بات!" بیگم بہرام نے فریاد کی "یعنی میں اس عمر میں اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے، اجنبی ان دیکھے ملکوں میں گھستی پھروں! نہیں بیٹا۔ یہ تمہارا کام ہے اور کام صرف اتنا سا ہے کہ . . . ."

پھر بیگم بہرام نے اپنے بیٹے کو کام کی تفصیل مہذب الفاظ میں بتلانے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر بیٹا بیٹھا سگرٹ پر سگرٹ پھونکتا رہا۔ اور مونچھوں کی نوکوں میں لگے ہوئے خشک موم کو جھاڑتا رہا۔

ہم بیگ جب پڑوسی ملک کے سب سے بڑے شہر کے ہوائی اڈے پر اترا، تو اسے اکٹھے اتنے بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑے کہ اس کا استخوانی ہاتھ دُکھنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ کو پتلون کی جیب میں رکھ کر صرف گردن کی جنبش سے تعارف و تسلیم کا فرض ادا کرنا چاہا۔ مگر لوگوں کی عقیدت اتنے جوش میں تھی کہ

انہوں نے ہم بیگ کا ہاتھ پتلون کی جیب میں سے گھسیٹ کر ایک مقدس تعویذ کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ اس کے ساتھ ہم بیگ کے گلے میں اتنے ہار ڈالے گئے کہ اگر اس کے سیکرٹری ساتھ ساتھ ہار اُتارتے نہ جاتے تو پھولوں کے انبار میں ہم بیگ کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ قریب قریب ہر ہار اُس کی دائیں یا بائیں مونچھ میں اٹک گیا اور اسے ہر مصافحہ سے پہلے اپنی مونچھ کو ہار کی دستبرد سے یوں تو اتر کے ساتھ آزاد کرنا پڑا جیسے وہ مصافحہ کے لئے ہاتھ کے بجائے مونچھ پیش کرنے والا ہے۔

ہوائی اڈے سے جائے قیام تک کے تین میل طے کرنے میں تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ مکانوں کی بالکونیوں پر سے اس پر پھولوں کے ٹوکرے اُلٹ دیئے گئے اور وہ اس دوران مونچھوں پر اُترنے والی پتیوں کو چُننے میں لگا رہا۔ شہریوں نے ملے تالیوں کے اس کے کانوں کے پردوں پر جیسے گھونسے برسا دیئے، وہ جہاں سے بھی گزرا، لوگوں نے اسے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا۔ کیونکہ وہ کار کی گدگدی سیٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا میزبانِ خاص جیسے اس کے سر پر بیٹھا تھا۔ جب اس کی کار گذر جاتی تو لوگ قہقہے مار مار کر ہنسنے لگتے اور جن کی مونچھیں تھیں، وہ اپنی مونچھیں سنوارنے لگتے۔ ایک بار اُس نے پلٹ کر دیکھنے کا بھی حوصلہ کیا۔ لوگ کھلی سڑک پر بے ترتیبی سے پھیل کر ہنستے ہوئے، ایک دوسرے کے ہاتھوں پر چٹاخ چٹاخ سے ہاتھ مار رہے تھے اور پھر پیٹوں کو ہاتھوں سے دبا کر ہنسی پر قابو پانے میں کوشاں تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے میزبانِ خاص سے پُوچھا۔

اور میزبان بولا "عوام مارے خوشی کے ہنس رہے ہیں۔"

وہ اسے کیسے بتاتا کہ عوام دراصل کیوں ہنس رہے ہیں۔

"یہ ٹھیک ہے۔" اس نے جائے قیام کے غسل خانے میں جا کر سوچا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ اس مُلک میں میرے آٹھ کارخانے، پانچ بنک اور دو بیمہ کمپنیاں ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس ملک کی لگ بھگ آدھی اقتصادی قوّت کی باگیں میرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ مگر ایسا استقبال بھی کیا کہ انسان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔ آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟" اس نے کپڑے بدلنے اور مونچھوں کی نوکوں میں سوزنی باریکی پیدا کرنے کے بعد، ڈرائنگ روم میں جا کر اپنے میزبان سے پُوچھا۔

میزبان تکلّف میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ ابھی کہاں، "ابھی تو آپ ہمارے ہاں کے تعلیمی اور تہذیبی اور صنعتی اداروں میں قدم رنجہ فرمائیں گے۔ ابھی تو آپ ہمارے مناظر کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازیں گے، اور آپ کو سپاسنامے قبول فرمانا ہوں گے اور ضیافتوں کو رونق بخشنا ہو گی اور۔۔۔۔"

"بات یہ ہے صاحب،" ہم بیگ نے میزبانِ خاص کی بات یوں کاٹ دی اور پھر کچھ اس انداز سے بولنا شروع کیا جیسے وہ اپنے وطن میں اپنے مرکزی دفتر کی گردشی کُرسی پر بیٹھا کسی غیر ملکی تجارتی وفد سے سودا طے کر رہا ہے۔ "بات یہ ہے کہ اتنا ہی کافی ہے۔ مَیں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ نے اتنی محبّت کا اظہار کیا۔ سو آپ کا شکریہ۔ لیکن مَیں تو یہاں آپ کا ملک دیکھنے کے بجائے اپنا کاروبار دیکھنے آیا ہوں۔ ساتھ ساتھ آپ کا ملک بھی دیکھتا جاؤں گا۔"

اپنے تین درجن سیکرٹریوں میں گھرے ہوئے منحنی ہم بیگ کی ایک مستقیم بات نے چوڑی پیشانیوں اور چکنی کھوپڑیوں پر سلوٹیں پیدا کر دیں۔ سب ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگے مگر میزبانِ خاص نے حالات کو سنبھال لیا اور آخر طے پایا کہ جب

ہم بیگ اپنے اداروں کے معائنے کے بعد واپس ہو گا تو اسے ایک رخصتی ضیافت میں ضرور شریک ہونا ہو گا۔

"اور آج شام میرے ہاں کی ضیافت تو ہے ہی۔" میزبانِ خاص نے آخر میں کہا۔

"جی نہیں۔" ہم بیگ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "جو بات طے ہوئی ہے، اس میں آپ اضافہ کر رہے ہیں۔ آج شام کو تو مجھے اندرونِ مُلک روانہ ہو جانا ہے۔"

اور یہ اس شام کا ذکر ہے جب کوئی ڈیڑھ مہینے بعد ہم بیگ عازمِ وطن ہونے کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے شہر میں واپس آیا۔ اس کے طیارے کو علی الصباح پرواز کرنا تھی اس لئے شام کو موعودہ ضیافت کا انتظام کیا گیا۔

ایک سے لباس والے تین درجن سیکرٹریوں میں گھرے ہوئے ہم بیگ کے ساتھ پہلے تو میزبانِ خاص موسمی حالات کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ پھر جب اسے کھانے کی لدی اور سجی ہوئی نہایت طویل میز پر لا کر بٹھایا گیا۔ تو اس کے تیور یکایک بدل گئے، اس کے دائیں اور بائیں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں جو عُمر کے اس دَور میں سے گزر رہی تھیں جب جوانی کانٹے میں تُل جاتی ہے، اور اگرچہ میزبانِ خاص اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا مگر اس کے بھی دائیں بائیں نوجوان لڑکیوں کی ایک قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ بوڑھے لوگ اور ان کی بیویاں یا دوسرے لفظوں میں ان لڑکیوں کے والدین میز کے پَرلے سروں پر جمع تھے۔

میزبانِ خاص نے ہم بیگ کے دائیں بائیں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔"

"خوب!" اس نے کہا اور نیپ کن سے کھیلنے لگا۔

دعوت کے شروع ہوتے ہی اس کے دائیں بائیں کی لڑکیاں اسے ٹوہنے لگیں اور

ڈشیں پیش کرنے لگیں۔

"یہ پسند فرمایئے گا؟" دائیں لڑکی نے کہا اور جیسے رباب کے تار پر چار بوندیں گر گئیں۔

"جی نہیں۔ شکریہ" اور ہم بیگ نے بائیں طرف کی ایک ڈش کو دیکھا۔

"یہ تو یقیناً ناگوارِ خاطر نہیں ہوگا" بائیں لڑکی وہی ڈش اُٹھا کر بولی اور رباب کے تار پر چند اور بوندیں ٹپک پڑیں۔

"جی شکریہ!" ہم بیگ سامنے دیکھنے لگا۔

"یہ ملاحظہ فرمایئے"

"نہیں شکریہ!"

"ہمارے ہاں کا یہ خاص کھانا تو . . ."

"شکریہ!"

"آپ تکلف فرما رہے ہیں" میزبانِ خاص نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"جی نہیں!" ہم بیگ بولا "تکلف کیسا؟"

اور پھر دائیں بائیں کے علاوہ آس پاس کی لڑکیاں بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ مونچھوں والے کروڑپتی نے ایک ایک کر کے وہی ڈونگے اور ڈشیں اُٹھائیں جنہیں چند ثانیے پہلے وہ قبول کرنے سے انکار کر چکا تھا۔

موقعے کی نزاکت کو بھانپ کر میزبانِ خاص بولا "آپ کو کس چیز کا شکار زیادہ پسند ہے؟"

"شکار مجھے سرے سے پسند ہی نہیں۔ مار پیٹ مجھے اچھی نہیں لگتی" ہم بیگ نے جواب دیا۔

"کھیلوں میں شاید ٹینس سے آپ کے مزاج کو رغبت ہوگی؟" میزبانِ خاص نے پوچھا۔

اور ہم بیگ نے مونچھ پر سے چاول کا ایک دانہ اڑاتے ہوئے کہا "میں کوئی کھیل نہیں کھیلتا۔ وقت ضائع کرنے والا کوئی کام مجھے بھلا نہیں لگتا۔"

"بہت اچھی بات ہے، بہت خوبصورت بات ہے" میزبانِ خاص نے ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی اپنی بیٹیوں کو دیکھا۔ جن کی گھبراہٹ ان کے چہروں پر غازے کے پیچھے بھی دکھی پڑ رہی تھی۔

دعوت ختم ہوئی تو تقریروں اور جوابی تقریروں کا سارا پروگرام تلپٹ ہوگیا۔ کیوں کہ ہم بیگ یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے سیکرٹریوں کے جھرمٹ میں جا گھسے میزبانِ خاص لپک کر آیا اور کہا "حاضرین کا تقاضا ہے کہ آپ سے متعارف ہونے کی عزت حاصل کریں۔ آپ کو تکلیف تو یقیناً ہوگی۔ مگر میری درخواست ہے کہ آپ انہیں مصافحے کی سعادت ضرور بخشیں۔"

ہم بیگ نے پلٹ کر اپنے سیکرٹریوں کی طرف دیکھا اور پھر میزبانِ خاص کے قریب آ کر جب سامنے نظر دوڑائی، تو حاضرین ہٹ کر کھڑے تھے اور تمام حاضرات نے پریڈ کے سے انداز میں اس کے سامنے ایک صف باندھ رکھی تھی۔

ان لڑکیوں میں ایک عجیب و غریب اتحاد کارفرما تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک ہی مقصد کے لئے یہاں جمع ہوئی تھیں، اور ان میں سے بعض بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد ہم بیگ کی اس ضیافت میں شامل ہو پائی تھیں۔ اس تقریب کے لئے انہوں نے اس وقت تیاریاں شروع کر دی تھیں جب اخباروں نے مونچھوں والے کروڑپتی کی ان کے ملک میں آمد کی اطلاع شائع کی تھی۔ جو ذرا بھرے جسم کی تھیں۔ انہوں نے دُبلاپے کے کورس پر عبادت کی حد تک عمل

کیا تھا۔ جو دُبلی تھیں، انہوں نے اپنے جسم پر گوشت کی ایک متناسب تہہ چڑھانے کے لئے ٹونکوں کے گیلن پی ڈالے تھے، سانولیوں نے گورا ہونے کے لئے اور گوریوں نے سانولا بننے کی خاطر راتوں کو بھی دو دو تین تین گھنٹے کے بعد اُٹھ اُٹھ کر اپنے چہروں، ہاتھوں اور بازوؤں پر کریمیں ملی تھیں اور پاؤڈر چھڑکے تھے۔ کئی مونا لیزا کی مسکراہٹ کی مشق کرتے کرتے اپنی مسکراہٹ بھی گنوا بیٹھی تھیں اور ایسی مسکراہٹ کی عادی ہو چکی تھیں جسے صرف لوہار ہی گھڑ سکتے ہیں۔ کسی نے انگرڈ برگمین کی طرح سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر اور بالوں میں ہلکا سا تموّج پیدا کر کے بات کرنے کا اسلوب اپنایا تھا۔ کوئی نرگس کے وقار اور شہزادی مارگریٹ کی ذہانت کا خول اپنے چہرے پر چڑھائے کھڑی تھی اور کسی کو صوفیہ لورین کی سی از خود ننگی اور بگاڑ میں بناؤ کا انداز جکڑے کھڑا تھا۔ لباس جسموں کے اشتہار بنے ہوئے تھے اور کردار پتی سے متعارف ہونے کے لئے انہوں نے ہفتوں تک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، آنکھوں کو نیم وا کر لینے، نچلے ہونٹ کو اُوپر کے ہونٹ کے مقابلے میں ذرا موٹا کر لینے، نتھنوں کو پھول کی پنکھڑی کی طرح تڑپانے، گالوں میں ڈمپل پیدا کرنے اور گردن کی لمبائی کو نمایاں کرنے کی جو مشقیں کی تھیں وہ ایک رٹے ہوئے سبق کی طرح ان کے ذہنوں کی نوکوں پر جمع ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود ایک کو دوسری کی تمنا کا علم نہیں تھا۔ مگر تمنا سب کی ایک تھی۔

"ادھر دائیں طرف سے تعارف کی ابتدا ہو تو بہتر ہے۔" میزبانِ خاص نے تجویز پیش کی اور قطار کی دائیں طرف پہلے نمبر پہ کھڑی ہوئی میزبانِ خاص کی بڑی بیٹی جیسے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میزبانِ خاص نے ایک قدم دائیں طرف بڑھایا، پھر مُڑ کر دیکھا تو ہم بیگ وہیں کھڑا تھا۔

پلٹ کر وہ اس کے قریب آیا، تو ہم بیگ بولا "یہ سلسلہ طویل ہو جائے گا اور

مجھے جلدی سے جا کر سو جانا ہے۔ کیونکہ طیارہ علی الصباح اڑ رہا ہے۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خواتین کو میری وجہ سے تکلیف ہو۔ میں یہیں سے سب کی خدمت میں تسلیمات عرض کئے دیتا ہوں . . . . تسلیمات!" اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر سر کو ذرا سا جھکایا۔ قمقموں کی تیز روشنی میں اس کی مونچھوں کا سایہ اس کے گھٹنوں تک چلا گیا، اور پھر ہم بیگ اپنے سیکرٹریوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

سناٹا اتنا شدید ہو گیا جیسے کوئی چاہے تو اُسے چھُو لے۔

ہم بیگ اپنے سیکرٹریوں اور میزبانِ خاص کے ہمراہ دُور نکل گیا تھا۔

لڑکیوں کی صف جیسے زمین پر گڑ گئی تھی۔

پھر ایک لڑکی صف سے نکل کر کچھ ایسی آواز میں بولی، جیسے ڈھول کے پردے پر پتھر گر رہے ہوں "ہائے کیسا چیونٹا سا ہے بے چارہ۔" اور اس نے ایک قہقہہ اُگلا۔

ایک اور لڑکی صف سے ٹوٹ کر بولی "آج معلوم ہُوا کہ خُدا انسان کو صرف مٹی ہی سے نہیں بناتا۔ بعضوں کو تنکوں سے بھی بناتا ہے۔"

"مجھے تو اس کی مونچھیں مانگے کی لگیں۔" تیسری چہکی۔

"بھئی کسی کو مونچھوں کے سوا کچھ اور نظر آیا ہو تو کافر ہو، مجھے تو صرف دو مونچھیں کھڑی نظر آئیں۔" چوتھی نے کہا۔

لڑکیوں کے قہقہوں سے ساری فضا گونج اُٹھی۔

کار پر سوار ہوتے ہوتے ہم بیگ نے چونک کر میزبانِ خاص سے پوچھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟"

میزبانِ خاص جلدی سے بولا "لڑکیاں ہنس رہی ہیں۔"

وہ اسے کیسے بتاتا کہ دراصل وہ رو رہی ہیں۔

وحشی

"آ گئی"، ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے جیسے دو دو قدم پیچھے کھڑے رہنے تو کسی غار میں گر جاتے۔

"کتنے نمبر والی ہے؟" ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

"پانچ نمبر ہے"۔ بڑھیا کے عقب سے ایک پنواڑی بولا۔

اور بڑھیا ہڑبڑا کر، ہجوم کو چیرتی ہوئی یوں آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ بس کے بجائے بڑھیا کو دیکھنے لگے۔

"عجیب وحشی عورت ہے"۔ ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "لے کے جبڑا توڑ ڈالا"۔

"اے پاگل ہوئی ہے کیا؟" ایک اور نے فریاد کی۔

اتنے میں بس آ گئی۔ کنڈکٹر نے کھٹاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "پہلے عورتیں"۔

ہجوم کے وسط میں پہنچی ہوئی بڑھیا رک گئی اور ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر پر سے چادر اٹھا کر، بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلو کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دو ردیہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر، کنڈکٹر سے کہنے لگی۔ "تیری ماں نے

تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے"۔

"چل آ بھی مائی"۔ کنڈکٹر نے شرما کر کہا۔

"رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا پر تو نے جو بات کہی ہے وہ ہزار روپے کی ہے"۔ بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دوسری سیڑھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھ گئی جیسے بہت بلندی پر پہنچ کر چکرا گئی ہے۔ کنڈکٹر نے اسے تھام لیا۔ ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں بھر دیئے گئے، اور اس ریلے میں کنڈکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر، سیٹ کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی۔ "بڑی نرم ہے"۔ بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت، دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑھی پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے، سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی، اور کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی، پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشتِ شہادت اس کے گھٹنے پر بجا دی۔ عورت نے بھویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ "چکر آ جائے گا باہر مت دیکھو"۔

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی۔ "مجھے چکر نہیں آتا"۔

"مجھے تو آ گیا تھا"۔ بڑھیا بولی۔

"تمہیں آ گیا تھا تو تم باہر مت دیکھو، مجھے نہیں آتا اس لئے میں تو دیکھوں گی"۔ عورت نے کہا اور بڑھیا نے پوچھا۔ "تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمہیں چکر آ جائے گا؟"

عورت کی مسکراہٹ یکایک غائب ہو گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آرہا تھا، اُس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جُھک کر پھول کو غور سے دیکھا، پھر انگلی سے اپنی ہمسائی کا گھٹنا بجا کر بڑی رازداری سے بولی۔ "یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟"

"نقلی ہے!" عورت بولی۔

"نقلی ہے تو سونے کا ہوگا۔" بڑھیا نے رائے ظاہر کی۔

"رنگ تو سونے کا سا ہے۔" عورت نے کہا۔

"مجھے تو اصلی لگتا ہے۔ کسی جھاڑی سے اُتارا ہے۔" بڑھیا بولی۔

"تو پھر اصلی ہوگا۔" عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بجا دیا۔

"کیا ہے؟" عورت نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

بڑھیا بولی۔ "عجیب بات ہے۔ باہر تم دیکھتی ہو اور چکر مجھے آجاتا ہے۔"

عورت ذرا سی مُسکرائی۔

"سنو!" بڑھیا نے کہا۔

"کیا ہے؟" عورت نے پھر سے بھویں سکیڑ لیں۔

"لیڈی ہو؟" بڑھیا نے سوال کیا۔

"کیا؟" عورت نے جیسے بُرا مان کر پُوچھا۔

"ہسپتال کی لیڈی ہو؟" بڑھیا نے وضاحت کی۔

"نہیں!" عورت بولی

"تو پھر کیا ہو؟"

"کیا؟"

"کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں کرتی۔"

"کچھ تو ضرور کرتی ہو۔" بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

"ٹکٹ لے لو مائی۔" بڑھیا کو اپنے سر کے اوپر سے کنڈکٹر کی آواز سنائی دی۔

"دے دو۔" بڑھیا نے چادر کے پلّو کو مٹھی سے آزاد کر دیا۔

"کہاں جاؤ گی؟" کنڈکٹر نے پوچھا۔

"گھر جاؤں گی بیٹا۔" بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کنڈکٹر زور سے ہنسا۔ گوری چٹی عورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کنڈکٹر نے جیسے تمام مُسافروں کو مخاطب کر کے کہا "میں نے مائی سے پوچھا کہاں جاؤ گی۔ بولی۔ گھر جاؤں گی۔"

اب کے مسافروں نے بھی کنڈکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈکٹر بہت محظوظ ہُوا تھا اس لئے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا "گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی۔ یہ بتاؤ۔ میں کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟"

"والٹن کا۔" وہ بولی۔ "میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔"

مسکراتے ہوئے کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔ "ساڑھے پانچ آنے دے دو۔"

"ساڑھے پانچ آنے؟" بڑھیا نے چادر کے پلّو کی گرہ کھولتے ہوئے پُوچھا۔ "ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ غوثا تو کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اُس نے تو مجھے صرف یہ گول مول چونّی ہی دی ہے۔" اُس نے چونّی دو اُنگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈکٹر بولا "نہیں مائی۔ چار آنے نہیں۔ ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں۔"

بڑھیا کی آواز تیز ہوگئی "ساری دُنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے؟ کیوں؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں۔ میرا بوجھ ہی کیا۔ لے یہ چار آنے۔"

"عجیب مصیبت ہے۔" کنڈکٹر کے تیور بدل گئے، اور وُہ مسافروں کو سامعین بنا کر تقریر کرنے لگا۔ "میں تو کہتا ہُوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیئے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو، بس میں سفر نہ کرے۔ اب اس مائی کو دیکھئے۔ میو ہسپتال کے سٹینڈ پر بس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے والٹن بھی جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی۔ اس لئے کہ کسی نے اسے چار ہی آنے دیئے ہیں۔"

بڑھیا بچے کی طرح بولی "کسی نے کیوں؟ اپنے غونثے نے دیئے ہیں۔"

کنڈکٹر نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے اور اب کے مسکراتے ہوئے کہا "اس لئے کہ غونثے نے اسے صرف چار آنے دیئے ہیں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ بس سرکار کی ہے غونثے کی نہیں ہے۔ غونثے کی ہوتی تو وہ تم سے چار ہی آنے لیتا۔"

"کیوں وہ کیوں لیتا چار آنے؟" بڑھیا بولی "وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔ کماؤ ہے روز اپنے ریڑھے پر دودھ لاتا ہے۔ آج میں اسی کے ریڑھے پر تو آئی تھی۔ چار آنے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں مانگے۔ اس کی مجال تھی جو مانگتا۔ گود میں کھلایا ہے۔ اس کی سالی یہاں ہسپتال میں بیمار پڑی ہے۔ میں نے کہا چلو! اسے دیکھ لوں۔ اسی ریڑھے پر واپس آ جاؤں گی۔ مگر آج لڑکی کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس لئے غونثا وہیں رہ گیا ہے اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں۔ اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو تو یوں کر دو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو۔ میں تو کسان عورت ہوں نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی۔ تم کہیں اس نرم نرم گدّے کے تو ساڑھے پانچ آنے نہیں مانگ رہے ہو؟"

"نہیں مائی۔" کنڈکٹر نے تنگ آ کر کہا "سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی

گدّے ہیں۔"

بڑھیا نے حیران ہو کر پُوچھا "تو پھر میں کیا کروں؟"

"ڈیڑھ آنہ اور نکالو۔" کنڈکٹر بولا۔

"کہاں سے نکالوں؟" وہ بولی "بتا جو رہی ہُوں کہ میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چونی بھی غونثے نے دی ہے۔ کل اُسے لوٹا دوں گی۔"

کنڈکٹر صاف طور سے اپنے غُصّے پر ضبط کر رہا تھا۔ بولا "مجھے تو آج ہی چاہیئے مائی میں تو ٹکٹ کاٹ چکا ہوں۔ جلدی کرو۔ اتنے بہت سے اسٹینڈ گزر چکے ہیں، اتنی بہت سی سواریاں جمع ہو گئی ہیں۔ سب کے ٹکٹ کاٹنے ہیں۔ کوئی چیکر آ گیا تو جان آفت میں کر دے گا۔ بھئی لوگو خدا کے لئے اس مائی کو سمجھاؤ۔ جانا والٹن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی ہے۔ پھر کہتی ہے چونی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔"

بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر، بالوں میں پھُول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا "ایسوں کی تلاشی لینی چاہیے۔ ان کی جیبیں اکنیوں دونیوں سے بھری ہوتی ہیں۔"

بڑھیا اُس کے سر کے اُوپر چیخ اُٹھی "کیا تو میرے بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔ سر میں کوڑی کا پھُول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی۔"

پھُول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اُسے سیٹ کی طرف کھینچا۔ اور بڑھیا بیٹھ گئی۔

"عجیب وحشی عورت ہے۔" کسی کی آواز آئی۔

"یہ کون بولا؟" بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔

"ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اس کی زبان یوں لمبی لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔"

گوری چٹی عورت کو جھرجھری سی آگئی اور وہ یُوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے سچ مچ لٹکتی ہوئی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اُس کے اُوپر سے گزار کر کھڑکی سے باہر اُچھال دی ہے۔

"دیکھ مائی،" کنڈکٹر جو اس دوران میں دوسرے مُسافروں سے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا اس کے قریب آکر سختی سے بولا۔ "ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں؟"

"تُو تو تھانیداروں کی طرح بولنے لگا لڑکے۔ کہہ جو رہی ہوں کہ چونی یہ رہی۔ باقی رہے چھ پیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔ کل والٹن میں آکر بیٹھ جاؤں گی اور تو آئے گا، تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ کھرے کر لینا۔"

"لو اور سنو۔" کنڈکٹر نے سب مُسافروں سے فریاد کی۔

پھر یکایک اس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے اور وُہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جُھک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بجایا اور جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔ "دیکھ رہی ہو؟"

عورت نے اُسے سمجھاتے ہوتے کہا۔ "لگتے تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں، پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لڑکا سرکار کا نوکر ہے۔ ایک آنہ بھی کسی سے کم لے تو یا اپنی جیب سے ڈالے گا یا نوکری چھُوٹ جائے گی غریب کی۔"

"ہئے ہئے بے چارا۔" بڑھیا نے پیار سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈاکہ ڈالوں چھ پیسوں کے پیچھے۔ مجھے کیا خبر تھی، وہ غونشا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اسے کیا پتہ،

وہ بیچارا ابھی تو بڑھے پر لاہور آیا ہے، اب کیا کروں؟"

"یوں کرو۔" گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں۔ ۔ ۔"

اتنے میں کنڈکٹر آگیا۔ بڑھیا بولی۔ "بھتی لڑکے! مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح۔ ۔ ۔"

کنڈکٹر بولا۔ "بس مائی۔ اب سارا حساب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تجھے والٹن پہ ہی اُتار دوں گا۔"

بڑھیا کھِل گئی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کے جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے ——— چونّی ہی پر راضی ہو جانا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟"

"حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پُورا ہوا ہے۔" کنڈکٹر بولا۔

"تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟" بڑھیا پھر اُداس ہو گئی۔

"چھ پیسے مجھے مل گئے۔" وہ بولا

"کہاں سے ملے؟" بڑھیا نے پُوچھا۔

"اُس چودھری نے دیئے ہیں۔" کنڈکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں دیئے ہیں؟" بڑھیا نے حیران ہو کر پُوچھا۔

کنڈکٹر بولا۔ "ترس کھا کر دے دیئے۔"

بڑھیا اُٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی۔ "کس پر ترس کھایا؟" وہ چلاّئی۔

"تم پر اور کس پر۔" کنڈکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک کر اُٹھی اور چیخ کر بولی۔ "ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو۔ ۔ ۔ ۔"

گوری چٹی عورت فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت کی راڈ اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف

جانے لگی۔" یہ چھ پیسے کیا تیری جیب میں بہت کُود رہے تھے کہ تُو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیئے جیسے کتّے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔"

"لیجئے، یہ ہے بھلائی کا زمانہ۔" کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی رہی۔" ارے سخی داتا کہیں کے، تُو مجھ پر ترس کھاتا ہے، جس نے ساٹھ ستّر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیئے ہیں، تو ان ہاتھوں پہ چھ پیسے رکھ رہا ہے، جنہوں نے اتنی مٹی کھود دی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پہ ترس کھاتا ہے؟ کیا تیرے کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کے لئے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں؟ شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے؟"

پھر وہ کنڈکٹر کی طرف پلٹی۔" یہ چھ پیسے جو اُس نے مجھ پہ تھوکے ہیں۔ اسے واپس دے دے، اور مجھے یہیں اُتار دے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔"

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سٹینڈ پر رُکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پروا کئے بغیر دروازے میں سے نکلی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر وُہ اٹھی، کپڑے جھاڑے اور ناقابلِ یقین تیزی سے دالٹن کی طرف جانے لگی۔

بس میں سے کسی کی آواز آئی۔" عجیب وحشی عورت ہے!"

جنّ و اِنس

گلی میں قدم رکھتے ہی ماسٹر محمد یونس کو محسوس ہُوا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ بائیں طرف تو خیر ایک مکان کا پچھواڑہ تھا، مگر دائیں ہاتھ کو ٹیڑھی میڑھی دیوار پہ عورتوں اور ان کے کندھوں سے لگے ہوئے بچّوں کے میلے کچیلے بے دُھلے چہرے یُوں رکھّے تھے جیسے گھڑونچی پہ چھوٹے بڑے کائی لگے گھڑے سجے ہوتے ہیں۔ گلی طے کرنے تک ماسٹر یونس نے ان کی طرف کوئی تین بار دیکھا اور تینوں بار اُسے یہی شبہ گزرا کہ سب نے بچّوں سمیت، ایک ساتھ اُسے آنکھ ماری ہے۔ اگر منشی اللہ یار ناشاد اس کے آگے آگے نہ جا رہا ہوتا تو وہ کہیں رُک کر سوچ لیتا کہ اگر آگے جانا بہت ضروری نہیں ہے تو آگے نہیں جانا چاہیئے۔ کُوڑے کی ایک ڈھیری پر جو مُرغی مُرغا دانہ دُنکا چُگ رہے تھے، وہ بھی پہلے تو کُڑکڑائے مگر پھر چونچیں کھول کر ماسٹر یُونس کو انسانوں کی طرح دیکھ دیکھ کر مُسکرانے لگے۔ سب سے بڑا ستم یہ ہُوا کہ گلی کے بالکل مقابل والے دروازے پر جو عورت بائیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارا لئے اور صرف بائیں ٹانگ پر زور دیئے کھڑی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ماسٹر یونس کو اسے دوسری بار دیکھنے کا حوصلہ ہی نہ ہُوا۔ وہ کالے تہمند، کالے چولے اور کالے دوپٹے میں سچ مچ چمک رہی تھی۔ پھر اس عورت کے قریب پہنچ کر تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ سراسر غلط جگہ پہ آ گیا ہے۔

عورت نے دماغ کو چیر دینے والی خوشبو لگا رکھی تھی اور خوشبو صرف سونگھنے ہی کی نہیں، دیکھنے کی بھی چیز ہوتی ہے۔ سو ماسٹر یُونس نے خوشبُو کے منبعے کی طرف دیکھا اور اسے یہ معلوم کر کے صدمہ سا ہُوا کہ یہ عورت تو قریب سے بھی خوبصورت ہے۔ کالے دوپٹے کے نیچے اس کے ڈھیروں بال اُس کے کندھوں اور سینے پر بکھرے ہوئے تھے، کانوں کی طرف جاتی ہوئی چیری ہوئی آنکھیں پپوٹوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی تھیں، اور اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسی خفیف سی مگر ہمہ گیر مسکراہٹ تھی کہ دیکھو تو کچھ نہیں اور سوچو تو بہت کچھ ہے۔

منشی اللہ یار کے قدموں کی تیزی بتا رہی تھی کہ وہ دائیں طرف کو فوراً مڑ جانا چاہتا ہے، مگر یکایک وہ یوں بھدے پن سے رُک گیا جیسے نہ رُکتا تو اس کا انجام نیک نہ ہوتا۔

"خیر ہے بیگماں؟" اس نے عورت سے پوچھا۔ پھر فوراً بولا "ہمارے سکول میں یہ نئے ماسٹر آئے ہیں۔ ماسٹر محمد یونس، انگریزی پڑھاتے ہیں، بی۔ اے پاس ہیں۔"

بیگماں نے پپوٹے اٹھا کر اپنی لمبی لمبی بادامی آنکھیں پُوری کھول دیں اور بولی۔

"ہم تمہارے پڑوسی ہیں منشی جی۔"

ماسٹر یونس کو جواب میں کچھ نہ سُوجھا۔ اُس نے صرف مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر منشی اللہ یار اس کی مدد کو پہنچا اور کچھ یوں بولا جیسے بیگماں کی بات کا ترجمہ کر رہا ہو۔

"یہ بیگماں آپ کی پڑوسن ہے یونس صاحب!"

ماسٹر یونس جواب میں ایک بار پھر مسکرایا، اور منشی اللہ یار کے پیچھے دائیں طرف کو مڑ گیا۔ سامنے مقفل دروازے کے پاس پہنچنے تک اُسے اپنی گُدی پر بیگماں کی نظریں محسوس ہوتی رہیں، پھر اُس نے پلٹ کر چوروں کی طرح دیکھا تو بیگماں وہاں نہیں تھی صرف اُس کی خوشبو تھی جو ہر طرف سے اُمڈی آ رہی تھی۔

"بڑی تیز خوشبو ہے!" یونس نے آہستہ سے منشی اللہ یار کو جیسے راز کی ایک

بات بتائی۔

منشی اللہ یار جو چابی والا ہاتھ تالے کی طرف بلند کر رہا تھا، تالے کو مٹھی میں پکڑ کر ذرا سا گھوما۔ بیگماں کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر یونس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر عورتوں اور بچوں کا رُخ دیکھ کر رُک گیا جو دیوار سے ہٹ آتے تھے صحن کے پرلے گوشے میں ایک جھُولتے ہوئے چھپر کے پاس دھوپ میں ایک بڑھیا پیڑھی پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

"خیر ہووے اے منشیو!" وہ حقے کا کش ختم کر کے بڑی کراری آواز میں بولی "جوانیاں مانو۔ علم پڑھاؤ۔ اقبال بڑھے، دشمن زیر ہوں، سجن ڈھیر ہوں، ہم غریب میراثیوں کے آنگن کو تو آج بھاگ لگ گئے۔ اے بانو، اے کپتّا کی اولاد۔ کھڑی ہٹ ہٹ کیا تکے جا رہی ہے۔ کیا اپنی عادتوں سے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ ہم میراثی ہیں؟ جا کہیں سے لسی مانگ لا۔ سردیوں میں لسی فولاد کا عرق بن جاتی ہے۔ ادھر شیر بانو کے ہاں چلی جا۔ کمہار روز اتنی لسی بیچتی ہے کہ بچھڑوں کو پلا دیتے ہو، آج بچھڑے نہیں پئیں گے تو ہمارے منشی جی پی لیں گے، نمک کی ڈلی وہیں سے گھماتی لانا۔ آج میں نے نمک دانی کے چاروں خانے دیکھے ہیں، اس میں چڑیا کی بیٹ جتنا بھی نمک نہیں ملا، مجھے تو لسی میں نمک کی جگہ کھار ملا کر پلا دیتی ہوگی تو پر تو اپنی سی کر دیکھ، میں بھی تیرے جیتے جی تو تجھے مر کر نہیں دوں گی، وہ اور تھا جسے تو نے ڈس لیا تھا۔ میں تو مروں گی تیرے جنازے پر شہادت کی اُنگلی گھما کر۔"

منشی اللہ یار تالے کو مُٹھی میں لئے بڑھیا کی طرف دیکھتا رہا، ماسٹر یُونس بڑی سنجیدگی کے ساتھ نئے ماحول سے متعارف ہو رہا تھا۔ ایک میلی کچیلی نوجوان عورت آگے بڑھی چولھانے پر سے ایک بڑا سا کٹورا اٹھایا، اسے اپنے دوپٹے سے اندر باہر پُونچھا اور بڑھیا کے پاس آکر بولی۔ "اے پھُوپھی، اللہ کرے میں کل کی مرتی آج مر جاؤں۔ پر تو ایک ایک روپے کی شرط لگا لے۔ پہلے تُو مرے گی۔"

سب عورتیں ایک ساتھ ہنسیں۔ مگر بانو مسکرائی بھی نہیں۔

بڑھیا بانہوں کو ہوا میں پھیلا کر پکاری: "اے کُتیا کی اولاد، کیا مجھے شرط لگا کر ایک روپیہ ہارنا ہے؟" پھر ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگی۔ بانو بھی مسکرا دی اور ہاتھ میں کٹورا لئے چلی گئی پھر منشی اللہ یار بھی زور سے ہنسا اور ماسٹر یونس نے سوچا کہ آخر یہ کیا بات ہوئی۔ آخر منطق کا وہ کون سا اُصول ہے جس کے تحت اس موقعہ پر بڑھیا کا ہنسنا جائز تھا۔ بانو نہ جانے اس کی کیا لگتی ہے، زیادہ سے زیادہ بہو ہوگی۔ مگر ساسیں تو ایسی مُنہ پھٹ بہوؤں کو نوچ کے ڈال دیں۔

یکایک بڑھیا عورتوں اور بچوں پر برس پڑی۔ "تم کیا منشیوں کو اپنے گھیرے میں لئے کھڑے ہو، جاؤ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ منشی قربانی کا گوشت تھوڑی ہیں کہ چھپٹے پڑ رہے ہو کمبختو۔"

سب ہنسنے لگے اور ستم یہ کہ منشی اللہ یار بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے تالا کھولا۔ ہنستے ہوئے زنجیر کھولی۔ ہنستے ہوئے کواڑ کھولے اور کوٹھے کے اندر جانے سے پہلے اُس نے یہ کہنا بھی ضروری سمجھا کہ "ماسی فوراں۔ آخر تو کسی دن بوڑھی بھی ہوگی۔"

"نہیں!" بڑھیا نے زبان اور تالو سے نفی کا خاصا زوردار پٹاخہ چھوڑ کر بڑے رُعب سے کہا۔ پھر بڑھیا سمیت سب اس زور سے ہنسے کہ اپنے دروازے پر سے بیگماں پکاری: "ماسی فوراں بولی ہوگی۔"

بڑھیا بولی: "تو اور کون بولا ہوگا خوشبو آں بیگم۔"

جھینپنے کے بجائے بیگماں نے بھی زور کا ایک قہقہہ لگایا اور ماسٹر یونس چکرا کر رہ گیا یقیناً وہ نہایت غلط جگہ پر آ گیا تھا۔

میٹرک تک ہم جماعت رہنے کے بعد محمد یونس اور اللہ یار کی راہیں الگ الگ

ہوگئی تھیں، اور اب ماسٹر اور منشی کی حیثیت میں دونوں کی مُلاقات ہوئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے یونس نے اللہ یار سے ایک طویل خط میں تجدید محبت کی تھی اور بھرپور محبت کا جواب پایا تھا۔ یُونس مطمئن تھا کہ وہ ایک بالکل اجنبی جگہ میں نہیں ہوگا اور اللہ یار خوش تھا کہ وہ اپنے مڈل سکول میں مقرر ہونے والے انگریزی کے پہلے ماسٹر کو بڑے ٹھاٹھ سے ساتھ ساتھ لئے پھرے گا، دونوں غرض مند تھے اس لئے ملاقات کے بعد پانچ دس منٹ کے اندر وہ جدائی کے چند برس پھاند گئے اور ہم جماعتوں کی اپنائیت برتنے لگے۔

سکول میں ماسٹر یونس کے پہنچتے ہی منشی اللہ یار نے سکول کے چوکیدار کے سر پر اس کا بکس اور بستر رکھا اور اُس کے ساتھ چند لڑکے کر دیئے۔ جنہوں نے مل کر کوٹھے کو جھاڑا پونچھا۔ اب تفریح کے وقفے میں وہ یونس کو اس کا مکان دکھانے لے آیا تھا۔ یُونس نے جب کوٹھے میں قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں تھوڑی ہی دیر پہلے چھڑکاؤ ہو چکا ہے، کچے فرش کی مٹی جاگ رہی تھی، اور سوندھی سوندھی خوشبو سے کوٹھا لبالب بھرا ہوا تھا۔ چھت کے عین درمیان میں ایک گول سا بادریہ تھا جس میں دُھوپ ایک ترچھے سے ستون کی شکل میں چھت سے فرش تک گڑی ہوئی تھی اور کوٹھے کے گوشے تک روشن ہو رہے تھے کوٹھے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو مٹی کی وہ بڑی بڑی الماریاں سی تھیں جو دیہات میں سکاریں کہلاتی ہیں اور اناج کے ذخیرے کے کام آتی ہیں۔ منشی اللہ یار نے بعد میں اسے بتایا کہ اب ان سکاروں میں بیٹھے ہوئے ایک ڈھول اور ٹوٹی ہوئی ایک شہنائی کے سوا کچھ نہ تھا دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ رنگ رنگ کے سُوت سے بنی ہوئی رنگیلے پایوں کی ایک پلنگڑی رکھی تھی اس پر بیٹھ کر باہر دیکھنے سے کچی ٹیڑھی دیوار کا ایک حصّہ اور بیگماں کے گھر کے سامنے والا موڑ نظر آتا تھا جہاں منشی اللہ یار ٹھٹکا تھا۔ میراثیوں کے مکان نظروں سے اوجھل

رہتے تھے جو دوسری طرف ایک دُوسرے میں بھینچے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک دالان تھا جس کے ایک کونے میں وُہ جُھکا ہوا چھپّر تھا جس کے پاس بڑھی نوراں پیڑھی پر بیٹھی حقّہ پی رہی تھی۔ یونس کی اس قیام گاہ سے نکلتے ہوئے' بائیں طرف تو یہ چھپّر پڑتا تھا اور دائیں طرف ایک تنگ سا صحن تھا جسے ایک پست دیوار' بیگماں کے گھر کے صحن سے جُدا کرتی تھی۔ اس دیوار کے بالکل سامنے بیگماں کا کوٹھا تھا اور جہاں اُنہیں بیگماں کھڑی نظر آئی تھی وہ اس کی ڈیوڑھی کا دروازہ تھا۔

کوٹھے کے فرش اور چھت کی صفائی کا جائزہ لینے کے بعد منشی اللہ یار نے یونس کو بتایا کہ نوراں' بانو کی ساس اور مست الست کی ماں تھی۔ بانو کے پیدا ہوتے ہی نوراں نے اسے اپنے بھائی سے اپنے بیٹے کے لئے مانگ لیا تھا۔ مست الست کا نام میراں بخش تھا۔ مگر جب اُس نے جوان ہو کر شہنائی بجانی شروع کی اور ساتھ ہی اس پر جنّ آنے لگے تو لوگوں نے اسے مست الست کہنا شروع کر دیا۔ یہ کوٹھا اسی مست الست نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب شادی کی محفلوں میں نکاح خوانی کے وقت ڈھولوں اور شہنائیوں کو بند کرنے کا اشارہ کیا جاتا تھا تو مست الست شہنائی پر سے انگلیاں ہٹا کر بچّوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ ایک بار جب کسی ایسے ہی موقعہ پر اس نے شہنائی بجانا بند نہ کی تو ایک بوڑھے میراثی نے شہنائی کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی' آواز بے سُری ہو گئی تو مَست الست نے اپنی بڑی بڑی لال آنکھیں کھولیں' شہنائی کو گھٹنے پہ رکھ کر تڑ سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور انہیں بوڑھے کی طرف پھینکتے ہوئے بولا "لو چچا آج رات کا چولھا اسی سے جلانا۔" پھر وُہ اٹھا اور چلا گیا۔ جب سے گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ مست الست پہ جنّ آتے ہیں' بوڑھی نوراں دُور دُور سے تعویذ لاتی رہی اور اپنے بیٹے کو گھول گھول کر پلاتی رہی' سونے چاندی میں مڑھے ہوئے کئی تعویذ مست الست کے بازوؤں پہ باندھے اور گردن میں لٹکائے' پھر کسی نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ مست الست

کی شادی کر دے۔ کیونکہ جنّ عموماً کنواروں اور کنواریوں پر ہی آتے ہیں۔ نوراں برسوں سے گانے بجانے اور عید بقر عید کی کمائی جمع کر رہی تھی۔ وہ فوراً بانو کو بیاہ لائی' مگر اب مست الست نے شہنائی بجانا ہی بند کر دیا۔ یہ اس کی شادی کے کوئی چار مہینے بعد کی بات ہے' نوراں نے بانو کو سمجھایا کہ وُہ بڑے پیار کے ساتھ مست الست سے شہنائی بجانے کا مطالبہ کرے' مَست الست یہیں اسی رنگین پلنگڑی پہ چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ بانو نے آ کر پھُوپھی کا مطالبہ دُہرایا۔ مُست الست بولا "واہ کیوں نہیں بجاؤں گا۔ لاؤ میری شہنائی کہاں ہے؟" پھر وہ شہنائی بجانے لگا۔ نوراں اور دوسری میراثنیں اور میراثی دروازے سے ایک طرف ہٹ کر خوش خوش شہنائی سننے لگے' بیگماں بھی اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پہ نمودار ہوئی۔ اور مُست الست کو دیکھنے لگی۔ بانو جو بڑے غرور کے ساتھ سر اٹھائے اور سینے پر بازوؤں کی قینچی رکھے پلنگڑی کی پائنتی کی طرف کھڑی تھی۔ یکایک گھبرا سی گئی۔ مست الست کا سارا خون کھنچ کر اُس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا اور اُس کا ماتھا پسینے کے قطروں سے اٹ گیا تھا اور اُنگلیاں جیسے تشنّج میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ تب بانو چیخ کر باہر نکل آئی اور پکاری "میرے مست الست کو تو کچھ ہو گیا ہے!" سب لوگ اندر کوٹھے میں گھُس آتے۔ بیگماں باہر گلی میں آ گئی۔ مگر پھر واپس چلی گئی۔ "جنّ آ گئے ہیں۔" ایک بوڑھے میراثی نے کہا اور "بسم اللہ" پڑھ کر شہنائی کا سِرا ایک جھٹکے سے مست الست کے ہونٹوں میں سے نکال لیا۔ مگر ہوا یہ کہ شہنائی بوڑھے کے ہاتھ میں آ گئی اور مست الست پیچھے گر گیا' پھر جب اُس کی نبضیں دیکھی گئیں تو وہ مر چکا تھا۔ اس وقت نوراں نے دھڑاک سے ایک دو ہتّڑ اپنے سینے پہ مارا اور پھر ایک دو ہتّڑ بانو کی پیٹھ پہ مار کر بَین کرنے لگی "میرے مست الست کا دَم تو یہ سانپنی پی گئی لوگو' یہ جو میری بھتیجی ہے' میری بہو ہے میرے بیٹے کی قاتل ہے۔"

منشی اللہ یار یہ واقعہ سُنا چکا تو رازداری کے لہجے میں بولا "ہیراں جس کا بیٹا اس کی بہو سے پہلے مر جاتا ہے بہو کو یہی طعنہ دیتی ہے، اور پھر بانو بیچاری تو سیدھی سادی فرمانبردار اور بے زبان بہو ہے، میرا خیال ہے کہ مست الست پر جن نہیں آتے تھے، بیگمیاں آتی تھی۔ لیکن وہ میراثی تھا اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ بات زبان پر لاتا تو قتلے اُڑ جاتے، سو دوسروں کے ہاتھوں مرنے کے بجائے اُس نے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ اور مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی موت کے بعد بیگماں اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر آتی اور مست الست کے کوٹھے کی طرف دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو جاتا مگر وہ دیکھتی رہتی۔" یونس کچھ یُوں خوف زدہ نظر آنے لگا جیسے اُسے ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں لا کر چھوڑ دیا گیا ہے، جہاں بلّی کی آنکھیں بھی چیتے کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہیں، بڑی مشکل سے بولا "کیا آپ کو اتنے بڑے گاؤں میں میرے لئے یہی مکان مناسب نظر آیا تھا یار صاحب؟"

"نہایت غیر مناسب جگہ ہے،" منشی اللہ یار بڑی عاجزی سے بولا "مگر سردیوں کا موسم ہے جب باہر کھیتوں میں رات دِن گزارنے والے کسان بھی اپنے گھروں میں اُٹھ آتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی یہ مکان ناپسند ہے۔ مگر میں نے کہا پڑھا لکھا انسان اپنا ماحول آپ بنا لیتا ہے، میں کسی دُوسرے مکان کی کھوج میں رہوں گا جب تک اسے سَر چھپانے کی ایک جگہ سمجھ لیجئے، پھر یہ میراثی بڑے تابعدار بڑے بے ضرر لوگ ہیں، ڈھول شہنائی کی آوازیں البتہ آپ کو پریشان کریں گی مگر ——"

اتنے میں بانو لسّی کا کٹورا ہاتھ پر رکھے آئی اور بسم اللہ کہہ کر اُسے یونس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کٹورا لیتے ہوئے یونس نے بانو کو آنکھ بھر کر دیکھا اور کٹورا چھلک کر رہ گیا۔ "بسم اللہ بسم اللہ" کہہ کر بانو نے اپنے میلے چکٹ دوپٹے میں یُونس کی شلوار پر گرے ہوئے لسّی کے چھینٹے کو جذب کر لینا چاہا۔ وہ "نہیں نہیں کوئی ہرج نہیں" کہتا رہ گیا،

مگر جب بانو دوپٹے کا پلّو سنبھال کر سیدھی کھڑی ہو گئی تو دوپٹے کا میل یُونس کی چمکتی ہوئی شلوار کے بھیگے ہوئے حصے پر منتقل ہو چکا تھا "کوئی ہرج نہیں معمولی بات ہے۔" اس نے بانو کی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے کہا اور پھر اپنی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے لسّی کا اتنا بڑا کٹورا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گیا۔ آخری گھونٹ پر اُسے خیال آیا کہ اُس نے منشی اللہ یار کا حصّہ بھی پی لیا ہے مگر چپکے سے کٹورا بانو کے حوالے کر دیا۔ بانو واپس چلی گئی۔

منشی اللہ یار بولا "بانو کو آپ نے دیکھا؟ اگر کسی صاف ستھری دُھلی دُھلائی عورت کا ایسا ہی ناک نقشہ ہو تو کیا کوئی عورت اس کے سامنے سے نظریں جھکائے بغیر گزر سکے گی؟ مست الست کے بعد کسی نے اسے کنگھی کئے ہوئے بالوں اور دُھلے ہوئے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ اسی لئے لوگ اب یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ بانو پہ بھی جن آنے والے ہیں۔ لوگوں کو یقین ہے کہ مست الست کو اس کے جن نے مار ڈالا ہے، اور اب بھی راتوں کو اس کوٹھے سے شہنائی اور ڈھول بجنے کی آوازیں آتی ہیں، جو اچانک شروع ہوتی اور اچانک تھم جاتی ہیں اور پھر ٹوٹتی رات تک گاؤں کی اندھیری گلیوں میں کوئی سسکتا اور کراہتا گھومتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈھول اور شہنائی ان سکاروں میں رکھے ہیں اور اب تک کسی نے انہیں نہیں چھوا۔ مَیں نے ابھی کچھ دیر پہلے لڑکوں کو کوٹھا صاف کرنے کو بھیجا تھا۔ صفائی تو وہ کر گئے ہیں۔ مگر کہتے ہیں انہوں نے تالا کھولا تو ان کے پسینے نکل گئے، پھر اندر کوٹھے میں وہ جس گوشے میں بھی گئے کوئی انہیں اپنے قریب لمبی لمبی سانسیں لیتا محسوس ہوا۔ بعد میں بانو فرش پر پانی چھڑکنے آ گئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ ادھر نوراں نے بانو سے کہا، کہ ایک ایک جن سب "بڑھا کودن" کو پکڑ کر کھیلنے کے لئے دے دو، یہ بھی کیا یاد کریں گے کہ میراثیوں کے گھر آئے تھے۔ اس پر سب ہنستے رہے، اور

یوں ان کا خوف دُور ہُوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟"

"کوئی بات نہیں" یونس کو لسّی کے کٹورے نے کافی ٹھنڈا کر دیا تھا "جنّات سے گپیں رہیں گی، وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

منشی اللہ یار بڑے اطمینان کی ہنسی ہنسا۔ "مجھے معلوم تھا آپ ایسا تعلیم یافتہ آدمی ان وہموں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔"

دونوں سکول جانے کو اُٹھے ہی تھے کہ بانو لسّی کا ایک اور کٹورا لئے آگئی' اور اسے منشی اللہ یار کے ہاتھ میں تھما کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ "تم نے تو حد کر دی بانو۔" منشی اللہ یار اس مدارات سے واقعی گھبرا گیا تھا۔ "یہ کیا بات ہوئی کہ تم ہمارے لئے مٹکے بھر سے لسّی ڈھوتی پھرو۔"

یونس فوراً بولا "پہلے آپ کا حصّہ میں پی گیا تھا نا۔"

"اب ان کا حصّہ آپ پی جائیے۔" بانو نے منشی اللہ یار سے کہا۔

تینوں ایک ساتھ ہنسے اور باہر سے بوڑھی نوراں کی آواز آئی "اے بانو مجھے بھی بتا کیا بات ہوئی، کہیں کوئی جن تو نہیں پکڑ لیا منشیوں نے؟"

"اللہ توبہ ہے۔" بانو نے سنجیدہ ہو کر کانوں کو ہاتھ لگا لئے' اور کٹورا لے کر کوٹھے سے باہر نکل گئی۔

سکول میں چھٹی کے بعد جب یُونس گھر کی طرف روانہ ہوا تو اُسے کچھ ایسا لگا جیسے وہ جیتی جاگتی دُنیا سے عالمِ ارواح کی طرف جا رہا ہے۔ اُس نے دوستوں کی محفل میں جنّات کے وجُود سے ہمیشہ انکار کیا تھا، لیکن آج دن دہاڑے جنّات جیسے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے اور اُس کے کندھوں پر سے جھانک رہے تھے۔ یہ خیال بھی اُسے لرزائے ڈالتا تھا کہ اسے سونے کے لئے جو پلنگڑی دی گئی تھی وہ بانو کی شادی کی

پلنگڑی تھی اور مست الست نے اُسی پر دم توڑا تھا۔ اسے منشی اللہ یار پر بڑا غصّہ آ رہا تھا جس نے اُسے اس جہنّم میں لا ڈالا تھا، جہاں ایک طرف بیگماں کا آگ کی طرح بھڑکتا ہُوا حسن تھا، دُوسری طرف میلی کچیلی بانو اور ٹوٹی پھوٹی نوراں تھی اور درمیان میں جنّات سے بھرا ہُوا کوٹھا تھا جہاں مست الست کے بعد ساس بہو نے ایک رات بھی بسر نہ کی، مگر ایک غریب پردیسی اُستاد کے لئے اُسے ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر اُٹھا دیا۔ لالچ بُری بلا ہے' اس نے سوچا، اس لالچ نے بیگماں کے حُسن کو حلوائی کے طشت میں سجے ہوئے بتاشوں کے ڈھیر میں بدل دیا ہے۔ اور جو جوانی سے لبالب بھری ہوئی بانو ایسی عورت کو شادی والے گھروں میں صرف ایک دوئی چونی کیلئے بھک منگوں کی طرح رات دن گانے بجانے پر مجبور کرتا ہے اور جو ایک بڑھیا کے دل میں جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا مر چکا ہے، اس خیال کو پھٹکنے نہیں دیتا کہ جس آدمی کو اُس نے اپنا مکان پلنگڑی سمیت ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر دے دیا ہے' وہ بھی نوجوان ہے اور وہ بھی ایک ماں کا بیٹا ہے۔

یونس اس ارادے سے اپنی گلی میں مُڑا کہ وہ بیگماں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مگر بیگماں کا دروازہ خالی تھا۔ اُس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور لپک کر میراثیوں کے صحن میں آگیا تو نہ چھپّر کے پاس اُسے نُوراں دکھائی دی نہ چولھانے میں اُسے بانو نظر آئی، اُس نے چابی تالے میں ڈالی تو تالا اُسے موت کی طرح ٹھنڈا محسوس ہُوا۔ ایک دم اس پر خوف سوار ہو گیا۔ یہ سب کم بخت کہاں غائب ہو گئے' دن کو جو ننگ دھڑنگ بچے اُس نے دیکھے تھے وہ سب کہاں اُڑ گئے، منڈیروں پر سے چڑیاں تک غائب تھیں۔ ہر طرف اُلّو بول گیا تھا۔

اس نے تالے میں چابی گھما دی۔ کواڑ کی ایک چُول خاصی بھاری آواز میں بولی۔ "آیئے" وُہ گھبرا گیا۔ مگر پھر مُسکرانے لگا۔ ہمّت باندھ کر اندر دیکھا تو چھت کے

بادریہ میں سے سُورج کی روشنی اب چھ سات دِن کا چاند بن کر اس دیوار پر چمک رہی تھی۔ جس کے ساتھ رنگین پلنگڑی رکھی تھی۔ ایک بھونرا چھت کی ایک ایک لکڑی کو سُونگھتا پھر رہا تھا اور اُس کے پروں سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کہیں دُور ہوائی جہاز اُڑ رہا ہے۔

کچھ سوچ کر اُس نے سینہ تان لیا اور پلنگڑی پر جا بیٹھا، مگر بیٹھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا بیگماں دروازے میں کھڑی سامنے گلی میں دیکھ رہی تھی، یُونس اب کے آہستہ سے پلنگڑی پر بیٹھ گیا اور بیگماں کی یک رُخی تصویر دیکھنے لگا۔

نہ جانے اتنے صاف رنگ پر سیاہ لباس پہننے کا اُسے کس نے مشورہ دیا ہے۔ کر کالے دوپٹے کا حاشیہ بھی جگمگا رہا ہے۔ اُس کی آنکھیں کتنی لمبی ہیں کہ کنپٹیوں کے بالوں تک آ گئی ہیں اور اس کے ہونٹ کتنے حساس ہیں۔ بالکل گلاب کی پنکھڑیاں کہ ہاتھ بھر کی بلندی سے بھی تتلی اُڑتی ہوئی گزر جائے تو کپکپا کر رہ جائیں اور ٹھوڑی سے مڑتا ہوا خط کتنی لمبی گردن بناتا ہوا اس کے دونوں کندھوں پر بکھر گیا ہے ———

یکایک بیگماں پلٹ کر یُونس کو دیکھنے لگی۔ یُونس نے گھبرا کر پلنگڑی کے دائیں بائیں دیکھا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بیگماں تالی بجا کر آنی بے اختیاری سے ہنسی کہ اگر وہ پردیس میں نہ ہوتا تو اُس عورت کو ڈانٹ دیتا پھر وہ اندر چلی گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا جیسے یُونس کے کوٹھے میں چلا آیا، ادھر سے بانو تیز تیز قدموں سے آنگن طے کرتی ہوئی بیگماں کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہاں اُسے نہ پا کر یُونس کے کوٹھے کی طرف دیکھا اور اندر چلی آئی۔

"آؤ بھئی بانو کیسی ہو؟" یُونس نے پُوچھا۔

"چھٹی ہو گئی منشی جی؟" بانو نے پُوچھا۔

"ہاں!" وُہ بولا۔

"ادھر گلی میں کوئی زور سے ہنسا، میں سمجھی بیگماں ہنسی ہے۔ میں نے کہا جانے کیا بات ہے۔ باہر آئی ہوں تو گلی خالی ہے، جانے کون ہنسا تھا!" بانو نے سوال نہ پُوچھتے ہوئے بھی سوال پُوچھا۔

یونس بولا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہنسا یا کوئی ہنسا بھی کہ نہیں مگر تم ہنسی کی آواز سُن کر اس طرف کیوں بھاگیں؟" یونس نے ٹوہ لگانی چاہی۔

"یہی ذرا سا ہنس لینے کو جی چاہا۔" بانو نے جواب دیا "اکیلا آدمی ہنستا بھی تو بھلا نہیں لگتا۔"

یونس کے تیور بتا رہے تھے کہ بانو نے وہ الفاظ کہنے سے انکار کر دیا ہے جو وہ اس سے کہلوانا چاہتا تھا۔

بانو جاتے ہوتے دروازے پہ ذرا سا رُکی اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر جیسے ارادہ منسوخ کر دیا اور چلی گئی۔

اور یونس پلنگڑی کو سکاروں کی طرف کھینچ کر اس پر کچھ ایسے رُخ سے بیٹھ گیا جیسے اگر اس کی نظر دروازے کی طرف اُٹھ گئی تو بیگماں تالی بجا کر قہقہہ مار دے گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے منشی اللہ یار آیا اور یونس کو کوٹھے کے ایک گوشے میں دبکا ہوا دیکھا تو بولا "لاحول ولاقوۃ پلنگڑی ادھر کیوں گھسیٹ لاتے۔ یہاں تو آپ ٹھٹھر جائیں گے۔ ادھر دیکھئے دروازے پر دھوپ اب تک چمک رہی ہے اور پھر دروازے میں سے آپ کم از کم آسمان تو دیکھ سکیں گے۔"

یونس پلنگڑی سے اٹھا اور بولا "اس عورت کا نام بیگماں سے آسمان کب سے ہو گیا ہے؟"

منشی اللہ یار چونکا تو یونس بولا "بھئی یار صاحب، بات یہ ہے کہ دروازے میں ہر وقت وہ عورت عطر کی دوکان لگائے کھڑی رہتی ہے اور یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا؟" منشی اللہ یار نے مُسکرا کر پُوچھا "عورت کا کھڑا ہونا یا عورت کو دیکھنا؟"

"دونوں" یونس یوں ناگواری سے بولا جیسے ماسٹر اللہ یار کو پتہ ہے کہ بیگماں نے ابھی ابھی اپنے قہقہے کا چابک مار کر یونس کی کمر دوہری کر دی ہے۔

مگر منشی اللہ یار اپنی دُھن پہ اڑا رہا۔ وہ پلنگڑی کو گھسیٹ کر اس کی پُرانی جگہ پہ لے آیا اور بولا "بیگماں کا نظر آنا نہ آنا آپ کے لئے برابر ہے، گاؤں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وُہ آپ کی طرف یا میری طرف یا کسی اور کی طرف نہیں دیکھتی۔ وہ صرف ایک طرف دیکھتی ہے بس یہ کہ آدمی اُس کے تیوروں سے گھبرا جاتا ہے۔"

پھر منشی اللہ یار نے یُونس کا بستر کھول کر پلنگڑی پہ بچھایا، سکاروں اور دروازوں پر کُنڈوں اور کیلوں سے کپڑے لٹکائے اور پروگرام کے مطابق اسے گاؤں سے باہر گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں لے گیا۔ سورج اُفق میں آدھا پیوست ہو چکا تھا۔ گھروں سے نکلتا ہوا دھواں ایک موٹا میلا سا گدا بن کر گاؤں پہ پھیل گیا تھا۔ تھکے ہارے چرواہے مویشی کے گلوں کے پیچھے پیچھے لمبی لمبی سوٹیاں گردنوں پہ رکھے اور ان کے نیچے سے دونوں ہاتھ لے جا کر دن بھر کے تھکتے ہوئے بازوؤں کو سہارا دیئے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے بھدے بدرنگ کُتے تھے جو اپنے اُس پاس کی ہر چیز کو سونگھتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو یونس کے کترانے کے باوجود اس کی شلوار کا پائینچہ سُونگھ لیا۔ درختوں پر چڑیوں نے چیخم چاخ مچا رکھی تھی پھر یکایک چھدرے چھدرے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان مقبرے کا سنہری گنبد سا بن کر چمک اُٹھا۔ ہوا تیز ہو گئی جیسے اسی لمحے کے انتظار میں تھی۔ مگر اس تیزی نے گندم کے کھیتوں میں جو مسلسل اور متوازن سرسراہٹ پیدا کی، اُس نے منظر پہ خاموشی کی تہیں چڑھا دیں۔ سناٹا اتنا شدید ہو گیا کہ یونس کو ایسا لگا جیسے وہ اچانک بہرا ہو گیا ہے۔ "یار صاحب" وُہ اپنی

سماعت کو آزمانے کے لئے بولا۔ مگر اُسے اپنی آواز بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دی۔

"جی!" منشی اللہ یار نے کہا۔

اور یونس بچّوں کی طرح بولا "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"

منشی اللہ یار رُک گیا۔ اس نے یونس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں کا گوشت اپنی گرفت میں لے کر چھوڑ دیا۔ "حد کرتے ہیں آپ" وہ بولا "مجھے اس وقت ایک شعر سوجھ رہا ہے اور آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ کمال کرتے ہیں آپ۔" پھر اُس نے پُورے آسمان پر ہاتھ گھما کر پوچھا "آپ کو اس خوبصورت غیر زمینی لمحے سے ڈر لگ رہا ہے؟"

یونس گھبرا سا گیا۔ غیر زمینی لمحہ! ماورائی لمحہ! روحیں اور جنّات! مست الست اور بانو! ——

"بانو! تم کہاں؟" منشی اللہ یار کی آواز آئی اور یونس چیختا چیختا رہ گیا۔

منظر کے ماند پڑتے ہوئے سنہری پن میں بانو بالکل غیر زمینی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ بالکل ان دیویوں کی سی تصویر جن کے گرد ہالا بنا کر مُصوّر اُن کے نقوش کو صرف اس لئے دُھندلا دیتے ہیں کہ آسمان کہیں وقت سے پہلے نہ ٹوٹ پڑے۔ بانو کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ جہاں سُورج ڈوب چکا تھا اور اب اپنے لبادے کے سنہری اور سُرخ گوشے لپیٹ رہا تھا۔ تیز ہوا کا رُخ مشرق کی طرف تھا۔ جہاں رات جنم لے چکی تھی اور منظر کجلا گیا تھا۔ بجھتے ہوئے اُجالے نے بانو کے نقوش کی دلربائی غیر یقینی حد تک بڑھا دی تھی اور تیز ہوا نے اس کے جسم کی تراش کو پُوری تفصیل کے ساتھ نمایاں کر دیا تھا۔

"میں لکڑیاں چُننے گئی تھی" اس نے کہا اور جیسے سُورج نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے اُجالے کو سمیٹ لیا۔ شام یکایک سیاہ پڑ گئی۔

بانو کے سر پہ ہاتھ سے توڑی ہوئی لکڑیوں کا گٹھا تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں

سے تھام رکھا تھا—— "گھومنے نکلے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" یونس نے ماحول کا خول توڑ کر باہر نکلنا چاہا۔ "یہ گھوم رہے ہیں، اور مجھے گھما رہے ہیں۔"

بانو ہنسی، یہ ہنسی بیگماں کی ہنسی سے سراسر مختلف تھی۔ یونس نے سوچا۔ بیگماں کے قہقہے چابک کی طرح شڑاپ شڑاپ برستے ہیں۔ بانو کی ہنسی بلّور کے رنگ برنگے بنٹوں کی سی ہے جو پیتل کی پرات میں گر رہے ہوں۔

"گھومو اور گھماؤ۔" بانو اسی طرح ہنستی ہوئی بولی اور چل دی۔

یکایک یُونس کو خیال آیا کہ منشی اللہ یار جو آج دوپہر کو ذرا ذرا سی بات پر ہنس رہا تھا۔ اس وقت کیوں نہیں ہنسا۔ "یار صاحب!" اس نے کہا۔

"جی!" منشی اللہ یار جیسے نیند سے چونک پڑا۔

کیا اب آپ کو ڈر لگ رہا ہے؟ یونس نے پُوچھا۔

"ڈر؟" منشی اللہ یار بولا۔ پھر اُس نے دُور مغرب کے سُرمئی افق پہ بانو کے کاجل ایسے سائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "قسم کھا کر کہئیے یُونس صاحب! کیا آپ نے بانو کی سی عورت کہیں دیکھی ہے؟"

یونس بولا۔ "اگر میں جھوٹ بول دُوں کہ ہاں دیکھی ہے تو آپ کیا کریں گے؟"

"مَیں خودکشی کر لوں گا!" منشی اللہ یار بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور پھر یونس سے لپٹ گیا۔

اور یونس کو یُوں محسوس ہُوا جیسے اس پر جن آنے والے ہیں۔

عشا کی اذان کے بعد جب منشی اللہ یار ناشاد، یونس کو اپنے ہاں کھانا کھلا کر اور اپنی روتی بسورتی ہوئی غزلیں سُنا کر ہاتھ میں لالٹین لٹکاتے اُسے گھر چھوڑنے

آیا تو گلیاں سنسان ہو چکی تھیں۔ گھروں کے بند دروازوں سے ادھر کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز آ جاتی یا مردی سے ٹھٹھرتا ہُوا کوئی کُتّا یونہی رَوا رَوی میں چودھویں کے چاند کی طرف مُنہ اُٹھا کر بھونک دیتا۔ اپنی گلی میں مُڑتے ہی یونس کی نظریں بیگماں کے بند دروازے سے ٹکرا گئیں، پھر اللہ یار بولا۔ "لو بھئی یونس صاحب ہم چلے۔ یہ لالٹین لے لیجئے، جلا لیجئے گا۔"

یونس منشی اللہ یار کی جھجک کا مفہوم سمجھ کر بولا۔ "خدا حافظ، شب بخیر۔"

منشی اللہ یار کوئی جواب دیئے بغیر لالٹین تھما کر پلٹ گیا، اور جب اس کے قدموں کی آواز بھی بند ہو گئی تو یونس پر چاندنی رات کا آسیب مُسلّط ہونے لگا۔ خون سَر میں جمع ہو کر گونجنے لگا۔ اس کے کانوں کے پاس بیٹھا ہُوا ڈھول بجنے لگا۔ پھر اُسے چیختی ہوئی شہنائی کی آواز بھی سنائی دے گئی اور کسی کی گرم گرم سانسیں اُسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگیں، وہ تڑپ کر پلٹا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اگر بیگماں اُسے یوں بوکھلاتا ہُوا دیکھ لیتی تو کتنے زور سے قہقہہ مارتی۔

پھر اس نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ اُس کے سُوٹ کیس میں بی۔ اے کا ڈپلوما رکھا ہے اور وہ انگریزی کا معلّم ہے، اور جنات صرف اَن پڑھ وہمیوں ہی کی تاک میں رہتے ہیں۔ ذرا سا سنبھل کر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے کنجی نکالی اور آگے بڑھا مگر ابھی میراثیوں کے آنگن میں مُڑا ہی تھا کہ بیگماں کا دروازہ کُھلا اور ساتھ ہی خوشبو سے لدا ہُوا ایک جھونکا یونس پر اُمڈ پڑا، بیگماں کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"مَیں ہوں۔" وہ فوراً بولا۔

"مَیں کون؟"

"ماسٹر یونس!" اُس نے جواب دیا۔

"ہم تو ڈر گئے تھے۔" بیگماں بولی۔ "ہم سمجھے کوئی چور ہے یا کوئی جن ہے۔ دبے پاؤں

"کیوں چل رہے ہو؟ جوان آدمی ہو، جوانوں کے قدموں میں تو بڑی دھمک ہوتی ہے۔"

وہ ذرا سا رُکا، مگر اُسے کوئی جواب نہ سُوجھا۔ پھر خود بیگماں ہی نے کواڑ بھیڑ لئے تو اُس نے بڑھ کر اپنے کوٹھے کے تالے کو پکڑ لیا۔ تالا برف کا گولا ہو رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے کُنجی گھمائی اور کواڑ کھولے ـــــــ ایک کواڑ کے قلابے میں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آدمی بولا ہے۔ "آئیے!"

وہ لرز کر رہ گیا۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ کہیں بیگماں دروازے کو نیم وا کر کے اس کا مطالعہ نہ کر رہی ہو اور اس خاموش رات میں تو اُس کا قہقہہ ساری دُنیا میں گُونج جائے گا۔ کوٹھے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیا سلائی جلائی اور اس کا اتنا بڑا ڈولتا ہوا سایہ فرش، دیوار اور چھت پر پھیل گیا۔ لالٹین جلا کر اُس نے دروازہ بند کر دیا، اور پلنگڑی پر گر پڑا، مگر یوں کُود کر اُٹھ بیٹھا جیسے مست الست کی میّت پر گرا تھا۔ سگرٹ جلا کر وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا سایہ دروازے پر سے یوں بار بار گزر جاتا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہے، پھر سُوٹ کیس کھول کر ایک کتاب نکالی اور پلنگڑی پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف کوئی لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہے اور جیسے سکار کے اندر پھٹے ہوئے ڈھول پر کسی نے ہاتھ مارا ہے، اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور مُسکرا کر اپنا سر جھٹک دیا، وُہ غالب کی ایک غزل گنگنانے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے لالٹین بجھا دی، آنکھیں بند کر لیں۔ وقفے وقفے سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ چت لیٹ گیا اور غالب کی غزل کا یہ مصرع بار بار گنگنانے لگا۔ ع

پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

اس کا خوف آہستہ آہستہ دُور ہونے لگا اور وہ سو گیا۔

نیند میں اسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کا لحاف کھینچ رہا ہے، اس کی آنکھ

کھُل گئی یہ محسوس کر کے اسے بڑا اطمینان ہوا کہ اس کے لحاف کا آخری سِرا ابھی اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہے جہاں سوتے وقت تھا اور کمرے میں سوائے اس کے کوئی نہیں ہے، وہ پھر سے وہی مصرع یوں گنگنانے لگا جیسے اسمِ اعظم کا وِرد کر رہا ہے۔ ع

پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے شبستاں میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے، یہ چاندنی تھی جو دوسرے دروازے کی جھِرّیوں میں سے لمبی سیدھی تیلیاں بنی فرش پر منقش تھی۔ اچھا تو وہ اتنا بہت سا سو لیا تھا کہ چاند جو مشرق سے نکلا تھا۔ آدھا آسمان طے کر کے مغرب کی طرف کھسکتے ہوئے دروازے کی جھِرّیوں میں سے جھانکنے لگا تھا، تو پھر اب صبح تو خاصی قریب ہو گی۔

اچانک چاندنی کی تیلیاں بجھ گئیں، مگر پھر چمک اُٹھیں اور یونس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہے، کون گزرا ہے؟ اس وقت کون ہے جسے یہاں سے گزرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دروازے کی جھِرّیوں کا ایک بڑا حصّہ پھر سے بجھ گیا اور بُجھا رہ گیا۔ وہ چیخ اُٹھا۔ "کون ہے؟" سایہ ہٹ گیا اور یونس نے لپک کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ "آئیے۔" دروازہ بولا اور چاندنی جیسے کواڑوں کا بند توڑ کر اندر اُبل پڑی۔ یُونس نے آہستہ سے باہر قدم رکھا اور یوں بولا جیسے اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے کسی غیر مرئی وجود سے سرگوشی کر رہا ہے۔ "کون ہے؟"

کوئی جواب نہ پا کر وہ گلی میں آیا۔ بیگماں کی ڈیوڑھی کے بند دروازے کو دیکھا، گلی میں جھانکا، پلٹتے ہوئے اس نے ذرا دائیں ہو کر میراثیوں کے گھروندوں پر نظر ڈالی جو قبروں کی طرح ایک دُوسرے میں گھُسے ہوئے کھڑے تھے۔ "عجیب بات ہے۔" اُس نے زیرِ لب کہا اور کوٹھے میں آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے رُک گیا۔ دروازہ کھُلا رہنے دیا اور پلنگڑی پر دائیں کروٹ کو لیٹ کر دروازے میں سے باہر دیکھنے لگا۔

اسے منشی اللہ یار یاد آ گیا۔ اگر وہ بانو سے پیار کرتا ہے تو اس کا اظہار کیوں نہیں کرتا؟ بانو واقعی بڑی پُراسرار عورت ہے، اچٹتی نظر سے دیکھو تو دوسری نگاہ ڈالنے کی طلب ہی محسوس نہ ہو اور جو ذرا غور سے دیکھ لو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ اس کے نقوش تکمیل کی انتہائی تفصیلوں تک مکمل ہیں۔ مگر کھُلی خشک میلی لٹیں دھجیوں کی طرح لٹک کر آنکھوں اور منہ میں پڑ رہی ہیں۔ کُرتے میں کوئی چار جگہ تو پیوند لگے ہیں۔ اس کے ہاتھ کتنے میلے ہیں اور میلے ہیں تو کھُردرے بھی ضرور ہوں گے۔ پاؤں بالکل حیوانوں کے سے ہیں، پھیلے ہوئے پنجے اور پھٹی ہوئی ایڑیاں پھر وہ ان کڑاکے کے جاڑوں میں بھی ننگے پاؤں رہتی ہے۔ اس کا رنگ یقیناً صاف ہوگا۔ اس کی گردن سے ذرا نیچے کا حصہ جو کُرتے کے بٹن کے قریب نظر آتا ہے کتنا صاف تھا، چاندنی کا سا۔ یہی اُس کا اصل رنگ ہوگا۔ چہرے کا میلا سانولا رنگ اس کا اصل رنگ نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دو تین دن تک انگریزی صابن سے ہاتھ دھولے تو یہ میل اُتر جائے۔ منشی اللہ یار سے اِتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ اسے صابن کی ایک بٹّی ہی لا دے۔ محبّت کرنے والوں کی یہ قسم بھی عجیب ہوتی ہے کہ فراقِ محبُوب میں زار زار رو لیں گے۔ مگر محبوب پر ایک اِکنّی خرچ کرنے کی انہیں توفیق نہیں ہوگی۔ یونس نے سوچا۔ کل وہ منشی اللہ یار کی محبت کو غیرت دلائے گا۔ مگر وہ تو کہتا ہے کہ بانو کو وہ آخر دم تک نہیں بتائے گا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے۔ اس لئے کہ اب صرف اللہ یار محرومی کی آگ میں جھُلس رہا ہے۔ پھر بانو بھی اسی جہنم میں جھونک دی جائے گی۔ کیونکہ دونوں کو معلوم ہوگا کہ۔۔ "ہم،" منشی اللہ یار نے کہا تھا۔ "ہم سماجی مقامات کے کھونٹوں کے ساتھ کتوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں اور ہم زنجیر توڑ کر بھاگیں گے تو آوارہ کہلائیں گے۔"

یہ کیسی رٹی رٹائی کتابی محبت ہے یونس نے سوچا اور اِدھر منشی اللہ یار ہر سال ایک نئے بیٹے کا باپ بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ بانو دوسری

میراثنوں کے ساتھ صرف ایک دوّنی چونّی کے لئے دن بھر ڈھولک کوٹتی ہے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہے اور جب وُہ دلہن کی آمد کے بعد سب میراثنوں کے ساتھ چند پیسوں کی خاطر بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے، دُولہا کے باپ کا تعاقب کرتی ہے تو اس کے جسم کے تناسب کے مقابلے میں اس کا یہ غیر متناسب انداز کتنا بھونڈا، کتنا چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ "مگر بے چاری کرے بھی تو کیا کرے!" منشی اللہ یار نے کہا تھا۔ "اگر میں اسے ہر مہینے پانچ دس روپیہ دے دیا کروں تو میری بیوی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ مگر بانو کی پھوپھی تو اس سے پُوچھے گی کہ یہ دستِ غیب کا گُر تو نے کس مُردے سے سیکھا۔ اور اس کی پھوپھی کو یقین ہے کہ بانو چڑیل ہے، صرف اس کے پاؤں پچھلی طرف مڑنے سے رہ گئے ہیں۔ وہ کہتی ہے، مست الست کو یہی چڑیل نچوڑ کر پی گئی۔ وہ اسے گالیاں دیتی ہے اور کوستی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے بہلاتی بھی ہے کہ اگر بانو کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تو کہیں وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے محتاج نہ ہو جائے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کڑھتا ہوں اور خُونِ جگر پیتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہُوں یونس صاحب!"

منشی اللہ یار کی باتیں یاد کر کے یونس کو ہنسی آ گئی۔ عجیب بودا عشق ہے!

چاندنی میں کوئی گلی کی طرف سے آیا اور بیگماں کے بند دروازے کے پاس رُکے بغیر اندر چلا گیا تو کیا بیگماں کا دروازہ کھُلا تھا!

وہ جُوتے پہنے بغیر باہر لپکا، اور میراثیوں کے گھروں کو بیگماں کے گھر سے جُدا کرتی ہوئی پست حد بندی کے پاس جا کر اس نے دیکھا کہ بیگماں ایک آدمی کے ساتھ صحن کو طے کر کے دروازے تک پہنچی، پھر اُس نے دروازہ کھولا، دروازے کے بالکل سامنے ایک دیا جل رہا تھا۔ دونوں اندر چلے گئے، دروازہ بند ہو گیا اور دیا بُجھ گیا۔

وہ دروازے کو اتنی دیر تک گھورتا رہا کہ دروازے میں حرکت پیدا ہوگئی اور جس حد بندی پر وہ کہنیاں رکھے کھڑا تھا۔ وہ نیچے دھنسنے لگی، پیچھے ہٹ کر اُس نے سر جھٹکا۔ واپس اپنے کوٹھے میں آیا تو اس کی سانس پھُول رہی تھی اور جسم تپ رہا تھا، پھر اُسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کے کھلے دروازے کے سامنے سے شپ سے نکل گیا ہے۔ یُونس چونکا مگر پھر آنکھیں ملتے ہوئے پلنگڑی پر گر پڑا۔

کاش منشی اللہ یار کہیں آس پاس ہوتا تو وہ اس سے لپٹ جاتا۔

یُونس صبح کو منشی اللہ یار کے ہاں چائے پینے گیا تو اُسے رات کا سارا واقعہ سُنایا۔

"اُونچا سا قد تھا؟" اس نے پُوچھا۔

"ہاں!" یونس بولا۔

"بڑا سا طرہ تھا؟" منشی اللہ یار نے دُوسرا سوال پوچھا۔

"نہیں تو۔" یونس نے جواب دیا "میرے خیال میں ننگے سر تھا، پگڑی شاید اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔"

"پگڑی بغل میں ہو تو طرہ سر پر نہیں ہوتا۔" منشی اللہ یار کو دل لگی سُوجھی۔ پھر بولا۔ "راجہ ہو گا۔"

"راجہ؟" یونس نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"ہاں ہاں۔" وہ بولا "آ گیا ہو گا پردیس سے چھوٹے بھائی کو کہیں نوکر کرانے گیا تھا۔ بگیماں کو معلوم ہو گا کہ راجہ واپس آ رہا ہے۔ اسی لئے تو وہ اتنی چہک رہی تھی۔ مَیں نے کہا تھا نا۔ بگیماں کو گمراہ کہا جا سکتا ہے اُسے بدمعاش یا آوارہ کہنا مشکل ہے۔ بس وُہ عشق ایسے دھڑتے سے کرتی ہے کہ آوارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا شوہر اس کے انہی تیوروں سے تنگ آ کر کہیں بھاگ گیا ہے، بیچارے پارچہ باف ہیں۔

پھر جگہ جگہ کپڑے کے کارخانے لگ گئے تو کھڈی توڑ کر ہل بنا لیا، اور مزارعت شروع کر دی۔ سال بھر کا غلہ کما لیتے تھے، راجے سے بگیماں کی آنکھ وہیں کہیں کھیتوں میں لڑی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن شوہر نے جو بگیماں پر فدا تھا، بگیماں کے تھپڑ دے مارا۔ تھپڑ مار کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر منہ لپیٹ کر گھر سے نکلا اور دو ڈھائی سال ہونے کو آئے ہیں، پلٹ کر نہیں آیا، کہتے ہیں اودھر بلوچستان کی طرف سے ایران کی سرحد پار کر گیا۔ پچھلے سال اس گاؤں کا ایک آدمی خشکی کے راستے حج کرنے گیا تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ بگیماں کا شوہر اُسے زہدان میں سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ کے پاس ایک میلا سا چیتھڑا ہاتھ میں لئے کھڑا نظر آیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ادھر راجے کے عشق کا چرچا ہوا تو بگیماں کا بھائی اللہ نواز تبر ہاتھ میں لئے بہن کے گھر آیا اور قیامت مچا دی۔ پھر جب بگیماں نے اسے رو رو کر یقین دلایا کہ یہ سب دشمنوں کی کارستانی ہے تو اب اللہ نواز نے بہن کی خاطر سارے گاؤں سے لڑائی مول لے رکھی ہے، بگیماں کی چال ڈھال میں اسی لئے تو یہ بلا کا ٹھسا ہے، میدان صاف دیکھ کر بڑے بڑوں نے قسمت آزمائیاں کی ہیں، مگر بگیماں نے سب کو ٹھوکر پہ اُٹھا کر یوں اچھالا ہے کہ سب منہ کے بل گرے ہیں۔ اب یہ سب لوگ بگیماں کے جانی دُشمن ہیں، مگر بگیماں ہے کہ چتون پر بل ہی نہیں آنے دیتی۔ اپنی لگن میں مگن ہے۔ چار پانچ سال پہلے لڑکا ہوا مگر مر گیا، پھر شوہر بھی چلتا بنا۔ جب سے اکیلی ہے مگر اکیلی معلوم نہیں ہوتی، اکیلے تو ہم جیسے ہوتے ہیں کہ گھر میں بیوی ہے، بچے ہیں۔ مگر باہر گلی میں آؤ تو جیسے پنجرے میں سے نکلے ہو۔"

منشی اللہ یار ایک دم سنجیدہ ہو گیا، پھر بولا "آپ بگیماں کی پروا نہ کیجئے، اپنے کام سے کام رکھئے، آپ کو کیا اس کے پاس کون آیا کون گیا۔"

"مجھے کیا!" یونس نے جیسے احتجاجاً کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو کیا، گھوڑے پر چھول کھلے یا گدھا لوٹے، آپ کو کیا!" منشی اللہ یار نے یونس سے عُمر میں ایک سال بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "بالو کیسی ہے؟"

"میں نے تو اُسے کل کھیتوں کے بعد سے اب تک نہیں دیکھا۔" یونس نے جواب دیا۔

منشی اللہ یار فوراً بولا۔ "ڈاکٹر اقبال صاحب تو کہہ گئے ہیں کہ ع

"ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

یونس مُسکرا کر بولا۔ "تو پھر دیکھ۔"

مگر منشی اللہ یار رنجیدہ سا ہو گیا۔ پھر یونس نے اس خوف سے وہاں سے اُٹھ آنا چاہا کہ کہیں وہ کل کی طرح اس سے لپٹ کر رونے نہ لگے۔

وہ اُٹھا مگر پھر بیٹھ گیا۔ "یار صاحب، رات جنّات کو تو میں نے خوب چکر دیئے اور خوب مزے سے سویا مگر——"

"میں نے تو جان بوجھ کر جنّات کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔" منشی اللہ یار نے ایک بار پھر اپنے بڑے پن کا مُظاہرہ کیا۔

"سنئے تو۔ میں سویا تو خُوب مزے سے مگر آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک بار ایک سایہ میرے دروازے کے سامنے سے گذرا، دوسری بار یہ سایہ میرے دروازے کے سامنے یوں رُک گیا جیسے جھریوں میں جھانک رہا ہے، میں فوراً باہر آیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"راجہ اس سے پہلے بگیماں کے ہاں آیا یا بعد میں؟" منشی اللہ یار نے تفتیش شروع کی۔

"بعد میں۔" یونس نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ بگیماں ہو گی۔" منشی اللہ یار بولا۔ "آپ نئے نئے آتے ہیں نا۔ اس لئے

وہ جائزہ لیتی پھرتی ہو گی کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا۔ ٹوٹی راتوں کو تو کُتّے بھی سو جاتے ہیں، اس لئے کم بختوں نے ملاقاتوں کا بڑا مناسب وقت چُن رکھا ہے مگر بگیماں کو آپ کا کیا اعتبار —— یقیناً بگیماں ہو گی۔"

"وہی ہو گی۔" یونس بولا۔

تفریح کے وقفے میں منشی اللہ یار کے ہاں کھانا کھا کر یونس مفلر لینے کے بہانے گھر چلا آیا۔ بگیماں کا دروازہ کھُلا تھا۔ اُس نے پلٹ آنا چاہا۔ مگر جب تک وہ پلٹنے کا فیصلہ کرتا، اپنے صحن میں مُڑ آیا تھا۔ بوڑھی نوراں چھپر کے قریب پیڑھی پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے حقّہ پی رہی تھی۔ یونس کو دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ "دیلو میں ابھی ابھی سوچ رہی تھی کہ میرا منشی آئے تو پوچھوں کیا تیرے پاس جوڑوں کے درد کی کوئی گولی ہے؟ اسے میں صدقے تو تو خضری عمر پائے گا۔ اللہ اقبال بڑھے، اللہ ترقیاں دے۔"

"گولی تو ہے خالہ۔" یونس بولا۔ "مگر جوڑوں کے درد کی نہیں سر کے درد کی ہے۔"

"اے بسم اللہ! پہلے درد کا پٹاخہ سر میں ہی تو چھوٹتا ہے۔" نوراں نے اپنے سوکھے لمبے بازو اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ "جوڑوں میں یہ درد سر کے راستے ہی تو اترتا ہے۔ میں تو صبح سے کٹے ہوئے گوشت کے ڈھیر کی طرح پڑی ہوں، بچھا حقّہ پی رہی ہوں۔ اُٹھ کر ٹوپی میں ایک چنگاری تک نہیں رکھ سکتی، اور وہ کتیا کی اولاد، بالو، اکتّی کی نسوار خریدنے گئی ہے تو وہیں کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اے تیرے بچّے جیئیں ایک گولی نکال دے۔"

"ایک گولی مجھے بھی دینا منشی جی۔" بگیماں کی آواز آئی اور یونس ہڑبڑا کر پلٹا۔ بگیماں کھُلے لمبے بالوں کا ایک ڈھیر سینے اور کندھوں پر بکھیرے دروازے میں کھڑی تھی۔ مگر اس سے خوشبو نہیں آ رہی تھی۔

"تجھے کیا ہوا خوشبو آں بیگم؟" نوراں نے پُکارا۔

"اے خالہ!" بیگماں بولی۔ "میں نے کہا آج سر دھولوں، سر دھو کر بال سکھانے دھوپ میں بیٹھی، بال تو سوکھ گئے مگر سر پکڑا گیا ہے۔"

"خوشبو بھی تو پکڑتی ہے سر کو۔" نوراں بولی اور بیگماں ہنسنے لگی۔

یونس نے تالا کھولا، اندر جا کر گردن میں مفلر ڈالا۔ اسپرو کی تین گولیاں نکالیں، تالا بند کر کے اُس نے ایک گولی نوراں کو دی اور پھر بیگماں کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم میں سے اتنی بہت سی ٹھنڈی اور گرم لہریں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی گزرنے لگیں کہ وہ سمجھا بیگماں تک پہنچتے پہنچتے وہ کٹ کر ڈھیر ہو جائے گا۔ جب اس نے بیگماں کے ہاتھ پر دو گولیاں خاصے فاصلے سے ٹپکائیں تو اسے بیگماں دکھائی ہی نہ دی۔ پھر نہ جانے اُس نے کیسے کہہ ڈالا کہ "ایک کھا لو، ایک رکھ لو، پھر کبھی کام آجائے گی۔" یہ کہہ کر وہ گلی میں شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سا نکل گیا۔ پھر اُس نے بوڑھی نوراں کی آواز سنی وہ بیگماں سے پوچھ رہی تھی "کیا کہہ رہا تھا تم سے؟"

یونس سن سے رہ گیا۔ بیگماں کو ایک فالتو گولی دے کر جیسے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کر ڈالا تھا۔

بیگماں کی آواز آئی "کہہ رہا تھا گولی پانی سے کھانا۔"

تو کیا بیگماں کو معلوم تھا کہ اسپرو کی دوسری گولی میں یونس کی محبت اور ناموس دونوں سمٹ آئے ہیں!

یونس نے پلٹ کر بیگماں کی طرف دیکھا تو وہ تالی بجا کر اس زور سے ہنسی کہ یونس وہاں سے تقریباً بھاگ نکلا۔

وہ گھر کی طرف آتی ہوئی بانو کے قریب سے بھی زن سے گزر گیا اور سکول میں پہنچ کر بچوں کو ایسے ایسے لطیفے سناتے کہ وہ لوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔

سانپ اگر زہریلا نہ ہوتا تو بچوں کا نہایت محبوب کھلونا ہوتا۔ کوئی بڑے سے بڑا بقراط قسم کا بچہ بھی اس کی منقش جلد، اس کی بے آواز رفتار اور اس کے لہراؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ مگر سانپ کے زہر نے اُسے ایک مردود مخلوق بنا دیا ہے۔ یونس کبھی سانپ کے پھن سے بے پروا ہو کر آگے بڑھتا اور کبھی اس کی دوشاخہ زبان دیکھ کر کانپ جاتا۔ وہ کبھی اس کی جلد پر سے کوڑیاں اٹھا لینے پر آمادہ ہو جاتا اور کبھی اس کی پھنکار سے ڈر کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتا، وہ بیگماں کو بائیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارا لئے اور صرف بائیں ٹانگ پر زور دیئے سیاہ کپڑوں میں ملبوس کھڑا دیکھتا تو بیگماں کے چہرے اور ہاتھوں سے نکلتی ہوئی شعاعیں اسے اپنے ہالے میں جکڑ لیتیں، لمبی لمبی بڑی بڑی بادامی آنکھوں کی روشنی اسے اپنی گرفت میں لے لیتی، اور وہ گلی میں داخل ہوتے ہی مسمریزم ماسٹروں کے معمول کی طرح یوں بے ارادہ قدم اٹھانے لگتا جیسے بیگماں کے دروازے کے سامنے سے دائیں طرف اپنے کوٹھے کا رُخ نہیں کرے گا، بلکہ بیگماں کے سامنے رُک جائے گا، رو پڑے گا، اس سے لپٹ جائے گا جب رات آخری دموں پر آتی اور اس کے دروازے کے سامنے سے سائے اِدھر سے اُدھر کئی بار گزر چکے ہوتے اور جھریوں میں سے جھانک چکے ہوتے اور رات بھر کے جاگے ہوئے لوگ بھی سو چکے ہوتے تو راجے کے انتظار میں ٹھٹکا ہوا یونس دیکھتا کہ راجہ آتا۔ وہ سیدھا بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتا، پھر بیگماں اُسے اپنے کوٹھے میں لے جاتی، کوٹھے کے کواڑ کھلتے تو دروازے کے بالکل سامنے ایک دیا ان دونوں کے سایوں کے خطوط کو واضح کر دیتا۔ پھر کواڑ بند ہو جاتے، دیا بجھ جاتا۔ رات سناٹے کے شکنجے میں آجاتی۔ سارا گاؤں دم سادھ لیتا اور یونس کا جی چاہتا کہ وہ بیگماں کے صحن سے اس کے صحن کو جدا کرتی ہوئی ذرا سی دیوار کو پھاند جائے اور اس کے کوٹھے کے بند کواڑوں پر زور سے تھوک دے اور پوری قوت سے چلا کر کہے۔ "بدذات، بدمعاش، بدچلن۔"

پھر اُس کا رونے کو جی چاہنے لگتا۔

صبح ہو جاتی، بانو سر پر مٹی کا ایک برتن رکھے اڑوس پڑوس سے لسّی جمع کرنے چلی جاتی۔ بوڑھی نوراں ایک ہاتھ میں حقّہ اور دوسرے میں پیڑھی لئے دھوپ میں اس جگہ آ بیٹھتی جہاں سے وہ دھوپ کے ساتھ ساتھ سرکتی ہوئی شام کو اپنے کوٹھے میں چلی جاتی۔ مُرغیاں مُرغے ڈربوں سے نکل کر گھوروں کی طرف یوں لپکتے جیسے رات وہاں ان کے لئے کوئی غیبی ہاتھ اناج کی مٹھیاں بکھیر گیا ہے۔ میراثنیں اُپلوں کے لئے گوبر جمع کرنے نکل جاتیں، ان کے ٹھٹھرے ہوئے بچے یونس کے کوٹھے میں جھانکتے ہوئے اپنی ماؤں بہنوں کے بتائے ہوئے کاموں پر روانہ ہو جاتے، کوئی دھواں چھوڑتے ہوئے اُپلے پر ایک انگارہ رکھے واپس آتا۔ کسی کے بازوؤں میں چولھا گرم کرنے کیلئے باجرے کے سوکھے ٹانڈے ہوتے، کوئی لسّی سے بھرے ہوئے پیالے کو مارے احتیاط کے چھلکاتا ہوا ننھے ننھے قدم اٹھاتا یونس کے سامنے سے گزر کر غائب ہو جاتا۔ جس روز راجہ بیگماں کے پاس آتا، اس روز وہ بہت دیر سے اٹھتی، یا کم از کم یونس کو وہ تفریح کے وقفے سے پہلے تک دکھائی نہ دیتی۔ لیکن جس روز وہ نہ آپاتا، بیگماں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ڈیوڑھی کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی، اس کے بالوں کا ڈھیر اس کے کندھوں اور سینے پر بکھرا ہوتا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کر انہیں اُٹھا کرتی اور بازوؤں کو سر پر لے جا کر لمبی لمبی انگڑائیاں لیتی تو کالے کُرتے کی کھلی آستینیں اُس کے کندھوں پر گر پڑتیں اور اس کے سڈول بازو چمک اُٹھتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ آئی، دروازے پر کھڑی رہی اور یونس کے کوٹھے کی طرف دیکھے بغیر اندر چلی گئی۔ لیکن جب بھی وہ یونس کی طرف دیکھتی، یونس اس کی طرف بڑی بے حیائی سے دیکھ رہا ہوتا اور وہ تالی بجا کر اور قہقہہ مار کر اندر چلی جاتی۔

ایک بار وہ قہقہہ مار کر اندر جانے والی ہی تھی کہ ادھر سے بانو لسّی کا

برتن سر پر رکھے آ گئی اور بولی "کیا بات ہو گئی بیگماں؟"

اور ہنستی ہوئی بیگماں نے یونس کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہہ دیا "کچھ نہیں بانو۔ منشی جی کو دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی کہ اکیلا چاہے آدمی ہو چاہے جِن، کیسا لُٹا لُٹا لگتا ہے، جی چاہتا ہے اٹھا کر سامنے بٹھا لو اور کہانی سنانے لگو۔"

پھر وہ زور سے ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی اور بانو میلے سانولے چہرے پر دُھول سی اُڑاتی ہوئی سیدھی یونس کے دروازے پر آ کر بولی "سُنا منشی جی۔ بیگماں کیا کہہ رہی تھی؟"

یونس ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ بیگماں کی بات سُن کر خوش ہو یا خفا ہو، اس لئے خالی خالی آنکھوں سے بانو کی طرف دیکھا اور بولا "کوئی بات نہیں، پڑوسن ہے اس کا حق ہے جو چاہے کہہ لے۔"

"پڑوسن تو ہے۔" بانو بولی، اور چلی گئی۔

پھر یکایک یونس کو خیال آیا کہ اس نے متوازن بات نہیں کہی۔ بات کو واضح کرنے کے لئے وہ فوراً باہر آیا۔ بانو اپنے کوٹھے میں داخل ہو رہی تھی اور بوڑھی نوراں پیڑھی اور حقّہ لئے دھوپ میں بیٹھنے آ رہی تھی۔ "رَد بلائیں دُور بلائیں" وہ بولی، اور یونس واپس اپنے کوٹھے میں آ گیا۔

اس روز منشی اللہ یار بار بار یونس کو یاد دلاتا رہا کہ اس کی صحت خراب ہو رہی ہے اور اس کی آنکھیں سوجی رہتی ہیں اور اس کے ہونٹ تک زرد پڑتے جا رہے ہیں۔ اس نے مست الست کے کوٹھے کے آسیب تک کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر دو ایک روز میں اسے نیا مکان نہ ملا تو وہ بال بچوں کو اپنے گاؤں بھیج کر یونس کو اپنے ہاں لے آئے گا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔" اُس نے کہا "میں وہمی آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ جنات کی کارستانی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ آئے تھے تو سُرخ انار ہو رہے تھے اور اب کل ایک مہینے بعد یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ سکول میں نہیں ہیں، ہسپتال میں ہیں۔"

رات یونس نے بڑے اضطراب میں گزاری، لالٹین کی روشنی میں پڑھنے کی بھی کوشش کی، مگر آج اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ چاندنی چودھویں تھی مگر اس کے دروازے کا رُخ مغرب کو تھا اس لئے چاندنی بہت دیر تک اس کے کواڑوں کی جھریوں میں سے نہ جھانکی، منشی اللہ یار سے آسیب کا ذکر سُن کر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ اس سائے کو ضرور پکڑے گا جو قریب قریب ہر رات اس کے دروازے کے سامنے سے گذرا، اور کبھی کبھی یوں رُکا رہا جیسے اندر جھانک رہا ہے، پھر جب چاندنی تیلیاں سی بن کر اس کے فرش پہ منقش ہو گئی تو وہ اُٹھا اور آہستہ سے دروازے کی زنجیر کھول کر واپس پلنگڑی پہ آ بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اِدھر سایہ اُس کے دروازے کے سامنے سے گذرے گا، اُدھر وہ لپک کر کواڑ کھولے گا اور اُسے دبوچ لے گا اور شور مچا دے گا، آسیب سے مقابلے کا جذبہ اتنا شدید ہو رہا تھا کہ سکار کھول کر اور اندر ہاتھ لے جا کر اُس نے پھٹے ہوئے ڈھول پر بھی ایک ہاتھ مار دیا اور شہنائی بھی چھُو لی۔

وہ بہت دیر تک بیٹھا دروازے کو دیکھتا رہا۔ چاندنی کی تیلیاں بہت لمبی ہو گئیں مگر سایہ غائب رہا۔ ایک بار وہ باہر نکل کر صحن میں بھی گھوم آیا، واپس آ کر کواڑ بھیڑ دیئے اور ٹہلنے لگا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی، پھر یکایک اُسے باہر بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آہستہ سے کواڑ کھولے تو دبا دبا شور واضح ہو گیا۔ پست دیوار کے پاس جا کر اس نے بگیماں کے گھر میں جھانکا، پانچ چھ آدمی بگیماں کے کوٹھے کے دروازے پر جمع تھے، دروازے کا رُخ مشرق کو تھا، اس لئے وہاں اندھیرا تھا۔ پھر دروازے پر کسی نے دو بار ہاتھ مارا اور آواز آئی "دونوں سُن لو۔ بگیماں اور راجے، تم دونوں سُن لو کہ آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے، ہم اللہ نواز کو بُلانے جا رہے ہیں تاکہ اپنی بہن کا بندوبست وہ خود کرے۔ جب تک وہ آتا ہے تم جو چاہو

کر لو، اس کے آنے کے بعد تو اس کی تبر ہو گی اور تمہاری گردنیں ہوں گی۔ غضب خُدا کا، چِٹی چاندنی میں بدمعاشیاں ہو رہی ہیں۔ گاؤں کے گاؤں کو پلید کر ڈالا ہے تمہاری حفاظت کے لئے ہم نے باہر سے کُنڈا لگا دیا ہے، جب تک مزے کر لو۔" پھر وہ ہنسا اور چاندنی میں کھڑے ہوئے لوگوں کے پاس آ گیا۔

یونس نے کان دھر کر سُنا، اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بگیماں اکیلی ہوتی یقیناً کڑک کر جواب دیتی، تو پھر راجے بھی اندر ہی ہے اور دروازہ باہر سے بند ہے اور ایک دُوسرے میں گھُس کر کھُسر پھُسر کرتے ہوئے آدمیوں سے ایک آدمی کٹ کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا ہے وہ یقیناً اللہ نواز کو بلانے جا رہا ہو گا۔

یُونس دیوار پر سے ہٹ آیا اور جب وہ آدمی گلی میں نکل گیا تو یونس اپنے کوٹھے کے دروازے کے پاس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یکایک وہ تڑپ کر اُٹھا، سیڑھیوں کے چھپّر میں سے ایک لمبی سی لکڑی کھینچی اور باہر گلی میں بھاگ نکلا۔ گھوم پھر کر وہ بگیماں کے کوٹھے کے پچھواڑے تک پہنچ گیا اور کچی دیوار پر بھاری لکڑی کی ضربیں لگانے لگا۔ دھم دھم کی یہ مسلسل آواز رات کے سناٹے کو گونجا گئی اور بگیماں کے صحن میں کھڑے ہوئے لوگ یہ سوچ کر کوٹھے کے پچھواڑے کی طرف بھاگے کہ راجے اور بگیماں دیوار میں نقب لگا کر بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بہت سے قدموں کی دھب دھب سُن کر یونس لکڑی اٹھائے ایک اور گلی میں نکل گیا اور پھر لکڑی پھینک کر سرپٹ بھاگا۔ بگیماں کے پچھواڑے کی گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا کہ لوگ ابھی وہیں جمع ہیں۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی گلی میں آیا اور بگیماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی لگا تھا کہ کسی نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے دائیں طرف اپنے کوٹھے کے صحن میں گرا دیا، اسے گرانے والا بھی ساتھ ہی گرا، وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر

پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔

"میں بانو ہوں۔ بانو۔ میں اور کوئی نہیں ہوں۔ میں بانو ہوں" بانو نے اُٹھتے ہوئے کہا، اکٹھے بہت سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آنے لگی تو بانو نے یونس کو ہاتھ سے پکڑا اور اُسے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے کوٹھے میں لے آئی پھر لوگ ادھر بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ادھر بانو نے یونس کے کوٹھے کا دروازہ بند کر دیا اور وہ یونس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہانپتی ہوئی بولی "فکر نہ کرو منشی جی جب تم چھپّر سے کڑی کھینچ کر بھاگے تو میں جانتی تھی تم کہاں جا رہے ہو، پھر جب لگے دھم دھم سن کر باہر لپکے تو میں نے جا کر بیگماں کے دروازے کا کُنڈا کھول دیا اور اُسے بتا دیا کہ یہ میں منشی جی کا کام کر رہی ہوں، جو پچھواڑے میں تمہاری دیوار کوٹ رہا ہے، میں وہاں سے راجے کو نکال کر باہر سے کُنڈا لگا آئی ہوں، اب اللہ نواز آئے گا تو کوٹھے میں بہن کو اکیلا دیکھ کر وہ بیگماں سے کچھ نہیں کہے گا، اب تو اس کی تبرا ان لوگوں پر اُٹھے گی جن پر بیگماں نے سو بار تھوکا ہے اور آج اس سے بدلہ چکانے آئے ہیں۔"

بوکھلاتے ہوئے یونس نے ایک لمبی گہری سانس لے کر بانو کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سمجھے بغیر بولا۔ "تم تو بڑی اچھی نکلیں بانو!"

لالٹین کی روشنی میں بانو حیران سی ہو کر یونس کو ہٹ بٹ دیکھنے لگی، پھر وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور یونس سے چمٹ گئی، وہ اپنا چہرہ اس کے سینے پر رگڑتی رہی، اس کی گردن اور ٹھوڑی چومتی رہی، اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں کھینچتی رہی، اور کہتی رہی۔ "یوں بھی ہوتا ہے منشی جی، تم بیگماں کو چاہتے ہو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں، تم نے بیگماں کی مدد کرنی چاہی میں نے تمہاری مدد کر دی۔ میں نے تو تمہاری منڈیر پر پہرے دیئے ہیں، میں تو راتوں کو ان کواڑوں کو چومتی پھری ہوں منشی جی، مجھے تو تمہاری ایک ایک گھڑی کا پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو اور کہاں دیکھ رہے ہو۔ میں

نے تو ان چھریوں پر کان رکھ کر تمہاری سانسوں کی آوازیں سُنی ہیں اور تم مدرسے گئے ہو تو تمہارے قدموں کی خاک اُٹھا کر اپنی مانگ میں ڈال لی ہے، میں تم سے کچھ نہیں مانگتی منشی جی۔ میں تو اب عمر بھر اس ایک پل کو اپنے سینے سے لگائے لگائے پھروں گی، تم بے شک بیگماں کو چاہو، میں کون ہوتی ہوں تمہیں روکنے والی، میں کوئی تمہاری پڑوسن ہوں۔"

بُت کی طرح کھڑے ہوئے یونس کے دماغ کی سنسناہٹ گولوں کی طرح پھٹ پڑی اور یونس کے کواڑوں پر ایک ساتھ بہت سے ہاتھ پڑے۔

باہر ایک ہجوم جمع تھا اور بہت سے لوگ بیک وقت بول رہے تھے۔ "ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی جی کا دروازہ کھلا تھا، اور ہم سامنے سے گزرے تو بند ہو گیا۔ یہ منشی کیا کرتا پھرتا تھا۔ کیوں چھپتا پھرتا تھا۔ ہم کہتے ہیں راجے کو اسی نے بھگایا ہے۔ ہم اس سے پوچھیں گے ہم اس کے گلے میں پھندا ڈال کے پوچھیں گے۔"

"پھندا ڈال کر پوچھنے کی تو خیر تمہیں مجال نہیں۔" ایک اور آواز آئی۔ "مگر تم نے میری بہن کی عزّت کو تماشا بنایا ہے تو منشی سے بھی پوچھ دیکھو، پھر میری تبر تم سے پوچھے گی… منشی بھتی دروازہ کھولو۔"

بانو یونس سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے اس کی پسلیوں کو توڑ کر اندر گھس جانا چاہتی ہے۔

"دروازہ کھولو منشی۔" اللہ نواز پکارا۔

یونس نے پہلی بار بانو کے گرد اپنا ایک بازو لپیٹا اور اس کے بالوں کو چوما۔ پھر وہ بانو کو آہستہ سے الگ کر کے اور اسے پلنگڑی پر بٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو باہر سے کسی نے دروازے پر زور کی ایک لات ماری، پھر اکٹھے بہت سے آدمیوں نے زور لگایا اور دروازہ چوکھٹ سمیت اکھڑ کر دھڑاک سے یونس کے قدموں میں آن گرا۔ اللہ نواز ہاتھ میں تبر تھامے اندر آیا اور ذرا سا رُک کر جیسے بلند آواز میں سوچا۔ "یہ

کون ہے ؟" پھر کڑک کر بولا " تو کون ہے ؟" —— پھر باہر کے لوگوں سے پوچھا " تم نے کہا تھا منشی کنوارا ہے، پھر اندر یہ عورت کون ہے ؟"

لوگوں نے یلغار بول دی۔

پھر پھوٹتی ہوئی پو کے اُجالے میں جب عطر کی نہایت تیز خوشبو سے فضا مہک رہی تھی اور بوڑھی فوراں بیسیوں عورتوں میں گھری ہوئی اور گھٹنوں میں سر چھپا کر بیٹھی ہوئی بانو کی پیٹھ پر دوہتڑ مار رہی تھی، اور اپنے مست الست کے بین کر رہی تھی۔ منشی اللہ یار ہجوم کو چیرتا ہوا آیا اور یونس کے سامنے ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد ہر لفظ کو چباتا ہوا بولا " یونس صاحب ! مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

یونس یوں تڑسے گرا کہ خاموشی سے مار کھاتی ہوئی بانو تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑی ہوئی بیگماں یوں بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہے، پھر وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سورج اُبھرنے تک یہ خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گئی کہ بانو میراثن کے ساتھ پکڑے جانے کے بعد ماسٹر یونس پر جن آ گئے ہیں۔

امانت

دوپہر کے وقت زرد رنگ کی آندھی اتنے زور سے آئی اور یوں اچانک آئی کہ بی بی گل کا پونیوں کا بھرا ہوا چھابہ پہلے اُلٹ گیا اور پھر صحن میں بھاگ نکلا۔ پونیاں بکھریں تو جیسے ان میں جان پڑ گئی۔ اُڑن سانپوں کی طرح اِدھر اُدھر لپکیں، بعض نے ایک قطار کی صورت میں دیوار کا مورچہ سنبھال لیا اور تڑپ تڑپ کر آندھی کا مقابلہ کرنے لگیں، اور بعض جن کے قدم پہلے ہی ہلّے میں اکھڑ گئے تھے دیوار پر سے پھاند کر غائب ہو گئیں، لکائن کا پتلا سا پیڑ آندھی کے سپاٹے میں یوں جھکا کہ اگر ذرا سا اور جھکتا تو ٹوٹ جاتا۔ آس پاس گھروں کے آنگنوں میں بکھرے ہوئے روز کے کام کاج کے برتن دیواروں اور دروازوں سے ٹھن ٹھن ٹکرا گئے۔ بی بی گل نے سر کی سفید چادر کے دونوں پلّو مروڑ کر ٹھوڑی کے نیچے گرہ لگا لی مگر ان کی سفید سفید لٹیں اِدھر اُدھر سے نکل کر بڑی بیقراری سے اڑنے لگیں۔ وہ چھابہ اٹھانے کے لئے جھکیں تو اُن کے سفید کُرتے میں ہوا بھر گئی۔ کُرتے کو معمول پر لائیں تو چھابہ پھر سے لُڑھکا اور صحن کے ایک گوشے میں ڈرے ہوئے بچے کی طرح دبک گیا۔ اتنے میں بادل اس زور سے کڑکا کہ بی بی کو مٹی کے گھروندے بھی تانبے کی چادروں کی طرح بجتے سنائی دیئے اور وہ چھابے اور بچی کھچی پونیوں کو وہیں چھوڑ کر کوٹھے کی طرف لپکیں، کنڈی کھولی تو ایک دم اتنی بہت سی ہوا نے اندر گھس کر برتنوں کو جھنجھوڑ ڈالا، اور

کوٹھے کے ایک گوشے میں اُوپر تلے رکھے ہوئے صندوقوں کا مینار دھڑ دھڑا کے رہ گیا۔ بی بی نے دروازہ بند کرنا چاہا تو باہر سے آندھی کواڑوں کو ٹکریں مارنے لگی۔ بی بی نے ہاتھوں کے علاوہ کندھوں تک کا زور لگا کر دروازہ بند کیا۔ پھر ہانپتی ہوئی اپنے کھٹولے کے پائے پہ لٹکتی ہوئی تسبیح ہاتھ میں لے کر حسبنا اللہ کا ورد کرنے لگیں۔

بادل ایک بار پھر کڑکا اور بوندیں چھت پر گولیوں کی طرح پٹاخ پٹاخ پڑنے لگیں۔ آن کی آن میں پرنالے بہہ نکلے۔ بی بی گل نے تسبیح کو کھٹولے کے پائے سے لٹکا کر کھڑکی کھولی تو جیسے باہر سے اس کے پٹوں کو کسی نے دھکا دیا۔ تڑاخ سے کھلے اور بی بی پیچھے ہٹ گئیں۔ جھک کر انہوں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ بکائن کا درخت بارش کی چلمن کی اوٹ میں جھک جھک کر اور تن تن کر نہا رہا تھا۔ ایک کوّے کو تیز ہوا اور بارش نے زور سے پٹخنی دی اور وہ بکائن کی شاخوں میں پھڑپھڑاتا ہوا تنے کے پاس گر پڑا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دیوار کی اوٹ میں ہو بیٹھا جہاں پُونیاں بھیگ کر کیڑے سے بنی پڑی تھیں۔ بی بی گل نے سرپوش میں سے روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور کھڑکی میں سے نکال کر کوّے کی طرف پھینک دیا۔ کوّے نے کھڑکی کی طرف دیکھا، پھر جیسے مشکوک سا ہو کر اُڑا اور دیوار پر جا بیٹھا۔ مگر تیز ہوا اس کے پنجوں کے نیچے سے نکل گئی اور وہ دوسری طرف لڑھک گیا۔ بی بی کو کوّے کی حماقت پہ افسوس ہوا۔ کھڑکی بند کر کے کھٹولے پر آ بیٹھیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ چند ہی منکے گرانے تھے کہ اٹھیں، شلوار کے پائنچے اوپر چڑھا لئے، چٹائی اُٹھا کر جھاڑی اور اسے سر پر رکھ لیا، پھر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئیں۔ بارش کا زور اچانک کم ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بارش کا یہ زوردار چھینٹا صرف اس لئے بھیجا گیا تھا کہ آندھی میں سے زرد مٹی چوس لے جائے۔ دیوار کے پاس جا کر بی بی نے روٹی کا ٹکڑا اُٹھایا، اسے چُوما، ماتھے سے لگایا اور ہاتھ بلند کر کے دیوار پر رکھ دیا۔ پلٹ رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر یہ سمجھ کر کہ کواڑ ہوا سے بجے ہیں، کوٹھے کی طرف جانے لگیں۔ مگر دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" بی بی نے پُوچھا۔

"اے بی بی میں ہوں، گامی۔" آواز آئی۔

بی بی گل نے بڑھ کر کنڈی کھولی تو بوڑھی گامی سر پر بڑا سا صندوق رکھے اندر آ گئی اور خود ہی کنڈی چڑھا کر بولی۔ "ہائے میں مرجاؤں، میری نیک پاک بی بی کو مجھ گنہگار کی خاطر بارش میں بھیگنا پڑا۔ پوتڑوں کی نائن میری خاطر ننگے پاؤں بھاگی آئی۔ ہائے میں کمبخت گھر سے کیسی بے وقت نکلی ہوں کہ آندھی بارش سب سر پر سے گزار کے آ رہی ہوں۔ یہ نہ سوچا کہ نکلنے سے پہلے ذرا آسمان کی طرف دیکھ لوں۔"

"اندر آ جاؤ۔" بی بی بولیں اور کوٹھے کی طرف جانے لگیں۔

"ہائے میں مرجاؤں کیسا زور کا بادل کڑکا تھا بی بی۔" گامی نے کوٹھے کے اندر پہنچ کر سر پر سے صندوق اتارتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گناہ کتنے بڑھ گئے ہیں۔ یہ تو بی بی تم ایسے اکا دکا نیک پاک لوگ ہیں جنہوں نے دھرتی کے سینے میں میخیں گاڑ رکھی ہیں، ورنہ سچ کہتی ہوں، بھونچال آ جاتے، دھرتی کروٹ بدل جاتی۔ ہائے میں مرجاؤں، بادل گرجا تو میں سمجھی آسمان کے نیچے سے کوئی ستون نکل گیا ہے۔ اے مولا میری توبہ ہے، اپنے قہر سے بچا۔ تیری ذات بڑی بے پروا ہے۔ پر ہم گنہگاروں کو اپنے قہر سے بچا۔ میں کہتی ہوں، آج کہیں نہ کہیں بجلی بھی ضرور گری ہے۔ شام تک سن لینا بی بی۔ اتنی کڑک یونہی نہیں ہو جاتی کوئی بات ہوتی ہے تو بادل کڑکتا ہے۔ ہائے میری توبہ۔" گامی نے کانوں کی لویں چھو کر دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر دے مارے۔

"ایسا نہیں کرتے گامی۔" بی بی بولیں۔ "خدا ایسی توبہ سے خوش نہیں ہوتا کہ کان کھینچے جا رہے ہیں اور رانیں پیٹی جا رہی ہیں۔ نفل پڑھا کرو، تہجد پڑھا کرو۔ یہ بھی نہیں تو وہ سورتیں تو میں نے تمہیں یاد کرا دی تھیں، وہی پڑھتی رہا کرو۔"

"اے بی بی میں مرجاؤں، مجھے تو والنّاس پھر بھول رہی ہے آج کل۔" گامی اپنے

کپڑوں اور لٹوں سے پانی نچوڑتی ہوئی بولی۔" بہو سے پوچھا تو کہنے لگی۔ ہمیں بھی یاد نہیں۔ اے تیری یاد کو کتے لے جائیں، تجھے اس عمر میں بھی دس سورتیں یاد نہیں تو کیا اس وقت یاد کرے گی جب قبر میں آکر فرشتہ حساب پوچھے گا؟ یہ زمانہ آ لگا ہے بی بی۔ اب بادل گرجیں نہیں تو کیا برسیں؟ اور کیا بادل یوں برستے ہیں جیسے آج برسے ہیں؟ یُوں تو اُڑتی ہوئی چیل بھی بیٹ کر جاتی ہے۔ یہ سب ہمارے گناہ ہیں بی بی۔ میری بہو سے جتنا چاہے ماہیا سُن لو۔ ہیر را نجھے کا قصہ رٹا پڑا ہے۔ پر اسے دس سورتیں نہیں آتیں۔ چلو سُورتیں نہیں آتیں تو نور نامہ سہی، معراج نامہ سہی، وفات نامہ سہی۔ پر نہیں، اُسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ اُسے تو بس علی حیدر کے دوہڑے آتے ہیں اور وہ میرا بیٹا، وہ مہرا جس نے برسوں تک تیری بکری چرائی ہے اور ناظرہ قرآن پڑھا ہے اور جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ سُنتا ہے اپنی بیوی سے اور کہتا ہے ذرا اور کھل کر گاؤ۔ کہتا ہے اماں کی پروا نہ کرو، بوڑھے جب سوتے ہیں تو آدھے مرجاتے ہیں۔ قسم قرآن مجید کی بی بی میں نے اپنے کانوں سے یہ ساری باتیں سُنی ہیں۔ ہائے میں مرجاؤں، جانے مجھے اور کتنے دن جینے کا عذاب جھیلنا ہے۔"

گامی رونے لگی تو بی بی گل بولیں۔" اب روتی ہو گامی؟ پر یاد ہے تم بھی شادیوں، بیاہوں پر یوں کڑک کے گاتی تھیں کہ مسجد کے حجروں میں بیٹھے ہوئے نمازی بھی بتا دیتے تھے کہ گامی گا رہی ہے۔ یاد ہے تم مجھ سے پہلا سبق لینے آتی تھیں تو تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے تمہیں یہ سبق دیا تھا:۔

اوّل حمد ثنائے الٰہی جو مالک ہر ہر دا
اُس دا نام چتارن والا کسے میدان نہ ہردا

اوّل حمد لبے دی آکھاں جیندے ہیتھ ارادہ
جس بود کیتی نابود دوں خلقت، جفت کیتا نر مادہ

اور تم نر مادہ کے ذکر پر بے شرمی سے ہنسنے لگی تھیں، اور تم نے کہا تھا کہ ہائے میں مرجاؤں بی بی۔ تمہارے منہ سے یہ سُن کر کیسا عجیب سا لگتا ہے۔ یاد ہے نا؟ وہ تمہارا زمانہ تھا۔ یہ

آلی کا زمانہ ہے، اب روتی کیوں ہو؟"

" ہائے بی بی میں مرجاؤں تمہیں کیسی کیسی باتیں یاد ہیں۔" گامی نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا۔" ہائے ہائے سچ مچ میں نے کیسی گندی بات کی تھی۔ ہائے میری توبہ پر بی بی، یہ بتاؤ، میں نے اپنی ساس کی اور میرے گھر والے نے اپنی ماں کی کتنی خدمت کی۔ کبھی سُنا تم نے کہ ساس نے مجھے پاؤں دبانے کو کہا تھا، تو میں نے پاؤں نہیں دبائے یا اُس نے مجھے دس پھیرے پانی لانے کو کہا تو میں دوسرے پھیرے پر مچل بیٹھی۔ اُس نے مجھے گالی دی تو کیا میں نے جواب میں اسے گالی دی؟ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ سچ بتا بی بی کہ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

" نہیں نہیں۔" بی بی گل بولیں۔" اچھی بہو کا ذکر چلے تو آج سارا گاؤں تمہارا نام لیتا ہے، یہ بات تو ہے۔"

" تو پھر بی بی، کیا خدا میرے گناہ بخش نہیں دے گا؟"

" جو سچے دل سے توبہ کرے گا اُسے بخش دے گا۔"

" تو بی بی میں نے گیت گانے سے توبہ کی تو کیا کھوٹے دل سے توبہ کی؟"

" اس وقت توبہ کی جب تم گیت گا ہی نہیں سکتی تھیں۔"

" ہاں بی بی سچ کہتی ہو۔" گامی بولی۔" کوئی کھوٹ میرے دل میں ضرور رہ گیا ہے۔ جبھی تو میرا مہرا مجھ سے بالکل سوتیلے بیٹے کی طرح پیش آتا ہے۔ قرآن مجید کی قسم ہے بی بی، جب آلی پاس نہیں ہوتی تو میرے سامنے وہی ہاتھ بھر کا، کاکا بنا رہتا ہے۔ پر ادھر آلی نے ایک جھلک دکھائی ادھر مہر خاں آپے سے باہر ہوا۔ میں نے ایک دن کہا۔ مہرے مجھے شکر کی چائے مت پلایا کر۔ میری سانس کو کچھ ہو جاتا ہے۔ کہنے لگا۔ میں پہلے لاٹ صاحب سے دوستی کر لوں پھر چینی کا بندوبست بھی کر دوں گا، اور بی بی، جو میں پیالہ دھو کر کوٹھے میں رکھنے گئی ہوں تو اللہ کی قدرت کیا دیکھتی ہوں کہ میری بہو اور میرا بیٹا دونوں بیٹھے

چینی کی چائے پی رہے ہیں۔ میں بس اتنی سی بات کہنے کی گنہگار ہوں کہ کیوں بیٹا، لاٹ صاحب نے یہ چینی کیا ابھی ابھی بھیجی ہے؟ بگڑ کر بولا "اماں تم تو جانتی ہو آلی کے پیٹ میں بچہ ہے۔" میں نے کہا "بیٹا، آلی کے پیٹ میں تو بچہ ہے پر تمہارے پیٹ میں کیا ہے؟" اس پہ مجھے گھور کے دیکھا اور بھری ہوئی پیالی اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔"

بی بی گل بولیں "ہاں مجھے ستاں نے بتایا تھا کہ آلی کے ساتھ تمہاری بہو نہیں رہتی ہے پر یہ مہر خاں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"خدا اس کی حیاتی کرے، میرے گناہوں کا سایہ پڑ گیا ہے اور کیا ہو گیا ہے۔" گامی نے کرتے کو دونوں طرف سے چٹکیوں سے پکڑ کر خشک کرنے کی خاطر ہلانا شروع کر دیا۔ "دو دن پہلے ہم سب صحن میں بیٹھے تھے۔ مہینے بھر بعد آلی کی چھوٹی بہن کا بیاہ ہو رہا ہے اور آلی اس بہانے دے جوڑے پر جوڑا سلوا رہی ہے کہنے لگی "میرا اتنا چھوٹا سا صندوق ہے سب ٹھنسا پڑا ہے۔ اب یہ نئے کپڑے کہاں رکھوں۔ ریشم ہے، باہر پڑے رہیں گے تو جھینگر چھلنی کر ڈالیں گے۔" مہرا کہنے لگا "اماں کے پاس اتنا بڑا صندوق خالی پڑا ہے، اسی میں رکھ دو۔" میرے تو تلووں میں لگی اور چوٹی میں جا بجھی۔ میں نے کہا "نہیں بیٹا میرا صندوق خالی نہیں ہے۔" کہنے لگا "کیوں اس میں کیا رکھا ہے؟" میں نے کہا "میرا کفن رکھا ہے۔" اس پہ دونوں چپ ہو گئے، اور میں نے سوچا، چلو بلا ٹلی۔ کل شام کھانے کے وقت آلی پھر یہی رونا لے بیٹھی۔ میں تاڑ گئی کہ میرے صندوق کے سوا اس کے کپڑے کہیں نہیں ٹکیں گے، خود میکے سے جو صندوق لے کر آئی ہے وہ نامیوں کی کسوت سے بڑا نہیں ہے اور میرے اس صندوق میں تو بیس جوڑے سما جائیں اور جب بھی جوڑے دو جوڑے کے لئے جگہ خالی رہے۔ پھر بی بی یہ سامنے والی کنڈی کے ادھر ادھر طوطے بنے ہوتے ہیں نا۔ یہ ہمارے تمہارے زمانے کی چیزیں ہیں، اب تو صندوق بنانے والے ٹین کو ٹیڑھا کر کے اوپر ڈھکنا جڑ دیتے ہیں اور چلو

صندوق تیار ہو گیا، وہ اور زمانے تھے، جب ایسے ایسے صندوق بنتے تھے۔" گامی نے "ایسے ایسے" کہتے ہوئے صندوق بجایا، اور پھر اس پر کہنی رکھ کر بیٹھ گئی ——

"کل شام مہرے نے پھر وہی بات کہی کہ اماں آلی کو دے دو نا اپنا صندوق، بے چاری کے کپڑے ادھر ادھر ڈھیر پڑے ہیں۔ میں نے کہا "بیٹا پہلے مجھے مر تو لینے دو۔" دونوں چپ ہو گئے۔ پہ ابھی ابھی آندھی سے کچھ دیر پہلے جب وہ کوٹھے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ آلی نے مہرے کو طعنہ دیا تو مہرا بولا "بیچارے بوڑھوں کی حرص بڑھ جاتی ہے پر میری ماں ایسی حریص نہیں ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ میں اس سے صندوق خود اپنے لئے مانگ لوں گا۔" میں نے جی میں کہا "بیٹا تو اسے پڑھائے گا جس نے تجھے جنا ہے۔" بس پھر میں نے صندوق اٹھا کر سر پر رکھا اور اپنی بی بی کی طرف چل پڑی۔ آسمان کی طرف کون دیکھتا، میں تو پلٹ پلٹ کر گھر کی طرف دیکھتی آئی کہ کہیں مہرا آ کر صندوق نہ چھین لے۔ اس کے بعد بی بی جو آندھی آئی ہے تو ادھر میرے قدم زمین سے اکھڑے جا رہے ہیں ادھر میرا صندوق سر پر سے اکھڑا جا رہا ہے، اب پلٹوں تو مہرا دیکھ لے گا، نہ پلٹوں تو آندھی کہیں اٹھا کر دے مارے گی۔ پھر ایک جھونکے نے جو دھکا دیا تو میں چھوٹ ہو کر گری اور صندوق رہٹے کی دیوار کے پاس پڑے ہوئے ایک چوڑے سے پتھر پہ جا گرا۔ وہ جس پر رحما دن بھر بیٹھا حقہ پیتا رہتا ہے، پر تم نے کہاں دیکھا ہو گا بی بی۔ تیرا پردہ قائم رہے۔ صندوق گرا تو میں نے کہا صندوق گیا پھٹ گیا۔ پہ اٹھ کر دیکھتی ہوں تو بی بی پتھر کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں اور صندوق کا بس اتنا ہوا ہے کہ یہ ادھر والے طوطے کی چونچ ذرا سی اندر چلی گئی ہے۔ بس۔ ہائے کیسے زمانے تھے جب صندوق فولاد سے بنتے تھے —— آج کل تو ایسا لگتا ہے کہ لوہے میں گھی مکھی ملا کر ٹین کی چادریں بنائی جاتی ہیں۔"

بی بی گل ہنس پڑیں۔

"ہاں ہاں بی بی،" گامی بھی محظوظ ہو کر بولی۔ "آج کل کے صندوقوں پہ ہاتھ رکھو تو پچکے جا رہے ہیں۔ دُہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور ادھر یہ میرا شیر ہے۔" گامی نے اپنے صندوق پر دھب سے ہاتھ مار کر کہا۔ "پتھر کی سِل پر گرا تو اسے چیر پھاڑ کر چلا آیا۔"

بی بی ایک بار پھر ہنسیں۔

گامی ذرا سا آگے کھسکی اور بی بی گل کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔ "یہ میرا صندوق اپنے پاس امانت رکھ لے بی بی۔ تیرے پاس سارے گاؤں کا اتنا بہت سا سامان رکھا ہے تو ادھر کسی کونے میں میرا صندوق بھی اٹکا دے۔ اور کہیں رکھا تو مہرا اپنی لاڈو کے لئے اڑا لے جائے گا اور یہاں کسی کی مجال نہیں کہ امانت کے سامان کو سونگھ بھی لے۔ دُنیا جانتی ہے کہ یہ سامنے جو اُوپر تلے اتنے بہت سے صندوق رکھے ہیں، ان میں ہزاروں کا سونا اور ریشم بھرا پڑا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکو بھی جانتے ہیں۔ مگر مجال ہے جو ادھر کا رُخ بھی کر جائیں۔ بی بی کے صحن میں قدم رکھیں تو پتھر بن کر وہیں نہ گڑ جائیں۔ یہ ساری تیرے درود وظیفے کی برکت ہے بی بی —— تُو تو ہمارے سارے گاؤں کا مان ہے۔ میں اور کہاں جاؤں یہ صندوق کھڑکھڑاتی ہوئی۔ رکھ لوگی بی بی؟"

"کیوں نہیں رکھوں گی،" بی بی گل بولیں۔ "اتنے بہت سے رکھے ہیں تو کیا گامی کے صندوق میں کانٹے لگے ہیں جو نہیں رکھوں گی؟ پر مجھے کھول کے تو دکھا۔ میں اپنی تسلی کر لوں تُو اپنی تسلی کر لے، تو اپنی چیزیں گن لے۔ میں تیری چیزیں دیکھ لوں۔"

گامی بے اختیار ہنسنے لگی، پھر ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ "ہائے بی بی میں مر جاؤں، تُو تو بالکل بھولی بادشاہ ہے، تو کہتی ہے صندوق کھول کر اپنی چیزیں دکھا۔ یہ سامنے کُنڈی میں تالا جو لگا رکھا ہے تو اس لئے لگا رکھا ہے کہ کُنڈی میں تالا نہ ہو تو صندوق بالکل ننگا لگتا ہے۔ ورنہ میرے صندوق میں ہے کیا۔ کچھ بھی تو نہیں بی بی، جو کچھ تھا وہ مہرے کے بیاہ پر دے دلا دیا۔ کانوں میں یہ دو نبیاں ہیں یا ناک میں یہ خشخاش بھر کا تیلا ہے۔

وہ بھی اس لئے کہ مروں تو بیٹا یہ نہ کہے کہ اب کفن کہاں سے آئے گا۔"

"تو ہے، ایسا بھی کیا؟" بی بی گل نے شکایت کی۔

"ایسا ہی ہے بی بی ورنہ وہ لٹھ لے کر میرے صندوق کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟" گامی بولی۔ "کیا وہ نہیں جانتا کہ یہ میرے جہیز کا صندوق ہے۔ میں تو آج بھی اسے کھولتی ہوں تو بی بی میں مر جاؤں جو جھوٹ بولوں، مجھے تو اس میں سے مہندی کی خوشبو آتی ہے اور مہندی کی خوشبو ایسی کافر چیز ہوتی ہے کہ مجھے تو آج بھی چکر آ جاتا ہے۔ سو بی بی میرے صندوق میں تو بس یہ مہندی کی خوشبو ہے۔ کہو تو کھول کے دکھا دوں۔"

"نہیں نہیں، جب اس میں کچھ نہیں ہے تو رہنے دو۔" بی بی گل نے بکس کا بازو کا کُنڈا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ پھر بولیں۔ "ہائے اللہ سچ مچ کتنا بھاری ہے۔"

"فولاد ہے بی بی۔" گامی خوش ہو کر بولی۔ "مہرے کا باپ ہنس ہنس کر بتاتا تھا کہ اس فولاد سے یا انگریز کے جہاز بنتے ہیں یا یہ صندوق بنا ہے۔ کہتا تھا ایک انگلی موٹی چادر ہے۔ امرت بائی کی ہٹی میں وہ جو لوہے کی پیٹی گڑی رہتی تھی۔ پر تم نے کہاں دیکھی ہو گی بی بی۔ میں نے دیکھی تھی۔ ڈاکو آئے، دُکان لُوٹی۔ پیٹی پر ہتھوڑے برساتے رہے پر مجال ہے جو چوٹ کا ایک ناخن برابر بھی نشان اُبھرا ہو۔ بس اس صندوق کو اس پیٹی کا بیٹا سمجھ لو۔"

"بس ٹھیک ہے۔" بی بی گل مُسکرا کر بولیں۔ "رکھا رہے۔ انشاءاللہ محفوظ رہے گا۔"

"اے تجھے خدا ایمان نصیب کرے۔" گامی نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک بات کہوں بی بی میرا مہرا تیری بکری چراتا رہا ہے۔ چھوٹا سا تھا تو اندر بھی آ جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ تیرا دروازہ کھٹکھٹانے کا حوصلہ کرے اس صندوق کی خاطر۔ سو وہ ایسا کرے تو اسے کہلا دینا کہ جا نہیں دیتے۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گا۔" بی بی گل نے اعتماد سے کہا اور صندوق گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

گامی نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو کچھ اس طرح بولی جیسے کسی بزرگ کے روضے کا دروازہ کھولا ہے۔" اے میں قربان جاؤں تیری قدرتوں کے۔ اے میں صدقے جاؤں۔ لے دیکھ بی بی۔ باہر دیکھ، آسمان بالکل نیلا چٹ ہو رہا ہے اور دھوپ نکلی ہوتی ہے اور ہوائیں بند ہے جیسے کبھی چلی ہی نہیں تھی۔"

"اللہ کی شان ہے!" بی بی گل نے دروازے سے باہر جھانک کر کہا۔

گامی صحن میں چلی گئی۔ پھر بڑے دروازے کے پاس رُک کر پکاری۔" اے بی بی مجھے والناس بھول رہی ہے۔ اس کا سبق لینے آؤں گی کل پرسوں۔"

"اچھا۔" بی بی گل بولیں۔ پھر انہوں نے مصلیٰ بچھایا، کوزہ اٹھا کر پاؤں دھونے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

بیوہ ہونے کے بعد پندرہ بیس دن تک تو بی بی گل درود شریف پڑھ پڑھ کر اپنے شوہر کی رُوح کو ثواب پہنچاتی رہیں مگر پھر یکایک ایک پڑوسن کو دیکھتے ہی انہیں خیال آیا کہ ایک چرخہ خرید لینا چاہیئے۔ دوسری بیوائیں تو باقی عمر اپنے بچوں سے باتیں کرنے میں یا اپنے پوتوں کے پالنے جھلانے میں گزار دیتی ہیں۔ مگر بی بی گل تو تنہائی کی دوزیں پُر کرنے والی ان پچیوں ہی سے محروم تھیں، ان کے جب پہلا بچہ ہوا تو مرتی مرتی بچیں اور جب وہ بچ گئیں تو بچہ مر گیا۔ بچے کے ماتم کے ساتھ ساتھ انہی سیانیوں سے دُودھ خشک کرنے کے ٹوٹکے پوچھتی پھریں جن سے کچھ دن پہلے انہوں نے دودھ اُتارنے کے نسخے معلوم کئے تھے۔ چند برس کے بعد ان کے ہاں ایک اور بچہ ہوا مگر وہ مردہ پیدا ہوا اور وُہ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر رہ گئیں۔ انہوں نے نمازیں پڑھ پڑھ کے اپنے ماتھے پر چپہ بھر لمبی محراب ڈال لی۔ درود شریف اور استغفار شریف

کے کئی لاکھ نکالے۔ مگر جب وہ کچھ نہ کر رہی ہوتیں تو انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کہیں بہت اُونچائی سے نیچے گر رہی ہیں اور کوئی سہارا ڈھونڈنے کے لئے ہَوا میں ہاتھ پھیلائے ڈوبی جا رہی ہیں۔ روئی کے گالے کے سے ایک ننھے ہاتھ کیلئے وہ ہواؤں کو ٹٹولتی ہوئی ڈوبی چلی جاتیں۔ مگر اس خلاء کی تہ کو کبھی نہ چھُو پاتیں۔ اچانک نماز کا وقت ہو جاتا اور وہ جیسے ایک ڈراؤنے خواب سے چونک کر کوزہ اُٹھا لیتیں۔

پھر ایک روز کوئی کسان عورت اُن کے پاس آئی اور ایک صندوق میں بھرے ہوئے زیورات بی بی گل کے پاس امانت رکھ گئی۔ شوہر نے بہت سمجھایا کہ "ویسے بھی ہمارے ہاں اللہ کا دیا بہت ہے اس لئے سارے علاقے کے چوروں کی نظریں ہمارے گھر پر ہوں گی۔ اُوپر سے تم نے سینکڑوں روپے کی یہ امانت لا دلی۔ کوئی ڈاکو آ دھمکا تو دو بوڑھے کیا بگاڑ لیں گے اس کا، اور لوگ کہیں گے کہ ڈاکہ نہیں پڑا، خود کھا گئے۔ یہ نیا جنجال مت پالو، یہ تو پیغمبروں کے کام ہیں۔" مگر بی بی گل تو امانت کے اس مال کی یوں دیکھ بھال کرتی تھیں جیسے ماں بچے کی کرتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے پاس امانتوں کے ڈھیر لگنے لگے اور حالت یہ ہو گئی کہ دوسرے گاؤں کی عورتیں بھی سفارشیں کرا کے اپنا مال بی بی گل کے پاس جمع کر جاتیں۔ شوہر نے کچھ دن تک ٹوکا، مگر جب دیکھا کہ بی بی امانتوں کی دیکھ بھال میں بالکل محو ہو کر رہ گئی ہے تو چُپ سادھ لی۔ پھر جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو بی بی گل ایک بار پھر کہیں بہت اُونچائی سے نیچے گرنے لگیں اور ہَوا میں ہاتھ پھیلا کر رہ گئیں۔ کوئی پندرہ بیس دن بعد ستاں پڑوسن ان سے نُورنامے کا سبق لینے آئی تو ساتھ ہی اپنا چرخہ بھی اٹھا لائی۔ ادھر اپنے پوپلے منہ سے نُورنامے کا سبق رٹ رہی ہے۔ ادھر گھُوں گھوں چرخہ چل رہا ہے۔ ہتھی گھُومتی ہے۔ تکلا چکراتا ہے۔ پُونی کی روئی دھاگا بنتی ہے۔

اور دھاگا تکلے سے لپٹ کر چھلّی سی بن جاتا ہے۔ "اے ستّاں مجھے بھی ایک چرخہ لا دے۔" بی بی گل نے کہا اور ستّاں ہنسنے لگی۔ "لے بی بی تو کیا کرے گی چرخہ کات کر۔ تیرے ہاں کیا کمی ہے چادروں اور کھیسوں کی۔" مگر بی بی گل نے چرخہ خرید ہی لیا اور ہوا میں پھیلے ہوئے ہاتھوں نے ہتّھی اور پُونی سنبھال لی۔

اب ستّاں کا چرخہ بھی انھی کے ہاں رکھا رہتا۔ ستّاں کو جب بھی مہلت ملتی، رینگتی ہوئی آتی۔ گاؤں بھر کی نئی نئی خبریں سناتے ہوئے چرخہ سنبھال لیتی۔ بی بی گل بھی چرخہ لے بیٹھتیں۔ وہ بہت سا سُوت کات کر نُور بافوں کے حوالے کرتیں۔ چادریں اور کھیس بنواتیں اور انہیں طالب علموں اور مُسافروں کے لئے مسجد میں بھجوا دیتیں۔ "میں کس کے لئے جمع کروں۔" وہ ستّاں کے ٹوکنے پر کہتیں۔ "چیزیں آل اولاد کے لئے جمع کی جاتی ہیں اور میرے بعد تو بس اللہ ہی اللہ ہے۔" پھر وہ زور زور سے چرخہ گھمانے لگتیں۔

انھی دنوں ان کے ہاں ایک چور امانتوں کا مال چوری کرنے آیا۔ کہیں سے کُود کر بی بی گل کی چھت پر اُترا تو رانوں تک چھت میں دھنس گیا۔ چھت کی لکڑیوں نے اس کی رانیں ادھیڑ ڈالیں اور وہ بیہوش ہو کر وہیں پھنسا رہ گیا۔ صبح کو لوگوں نے بی بی گل کی پاکدامنی کا یہ معجزہ دیکھا تو سُبحان اللہ کہہ کر رہ گئے۔ اس کے بعد کسی چور کو ادھر کا رُخ کرنے کا حوصلہ نہ ہُوا اور بی بی گل سارے علاقے کی مقدس اور محترم ہستی بن گئیں۔

گامی کے جانے کے بعد وہ آخری رکعت پڑھ رہی تھیں اور التحیات بیٹھی تھیں۔ جب ستّاں آئی اور چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔ سلام پھیرنے اور دُعا مانگنے کے بعد انہوں نے ستّاں کی مدد سے گامی کا صندوق ایک طرف جمایا اور اسے ایک کپڑے سے خشک کرتے ہوئے بولیں۔ "رستے میں بیچاری کو بارش نے آ لیا۔ صندوق

بھیگ گیا ہے۔ خشک نہ کیا تو زنگ لگ جائے گا۔"

پھر انہوں نے ایک کندورا اُٹھا کر صندوق پر پھیلا دیا اور ایسی آسودگی سے چرخہ کاتنے بیٹھ گئیں، جیسے ان کی شخصیت کی تکمیل کی راہ میں فقط گامی کے اس صندوق کی کمی حائل تھی۔

گامی اس کے بعد کئی بار آئی۔ بھُولی ہوئی والنّاس یاد کی، نور نامے، معراج نامے اور وفات نامے کا آموختہ درجنوں بار دُہرایا۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے صندوق کے قصیدوں پر بھی عش عش کرتی رہتی کہ "ہاتے میں مر جاؤں۔ کیسا صاف ستھرا، چکتا دمکتا، ڈھپا ڈھپایا رکھا ہے، وہاں مہرے کے قابو میں آ جاتا تو طوطے کھوتے بن چکے ہوتے اور اندر آلی کے وہ کپڑے رکھے ہوتے جن کا آگا پیچھا یا خُدا جانے یا درزی جانے۔ تیرے نام میں ایسا جادُو ہے بی بی کہ مہرے کو بس ایک بار اپنے صندوق کا پتہ بتایا کہ وہاں رکھا ہے جب سے مجال ہے جو اُس نے چُوں بھی کی ہو۔ دنیا جہان کی بات ہو گی۔ صندوق کی نہیں ہو گی۔ اس کے لئے صندوق اس کے باپ کی طرح مر چکا ہے۔"

گامی کی باتیں سُن کر بی بی گل اور ستّاں خوب خوب ہنستیں۔ پھر وہ مہینے دو مہینے بعد صندوق کو تیل سے چُپڑتیں اور دُھوپ میں دن بھر رکھنے کے بعد اُسے رگڑ رگڑ کر صاف کرتیں۔ "آخر امانت ہے۔" بی بی کہتیں۔ "امانت رکھنے والیاں اپنی چیزیں مجھے نہیں دے جاتیں اپنے مولا کے حوالے کر جاتی ہیں۔ پھر میں خدا کے پاس رکھی ہوئی اس امانت کی خدمت کیوں نہ کروں۔"

ایک دن دوپہر کے قریب ستّاں آئی اور اپنے چرخے کے پاس بیٹھ کر پونیاں بنا بنا کر چھابے میں رکھنے لگی۔ اس وقت بی بی گل مصلے پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایک پوری تسبیح گھمانے کے بعد انہوں نے چار طرف چھوہ کی اور ستّاں کی طرف

دیکھا۔ "کہو ستاں کیا حال ہے گاؤں کا؟" "بس رہا ہے بی بی تیرے دم سے۔" ستاں بولی۔ "میں تو جدھر دیکھتی ہوں تیرے ان سفید بالوں کا نور چار طرف پھیل رہا ہے۔" پھر یکایک ادھوری پُونی کو روئی کے ڈھیر میں ٹھونس کر بولی۔ "اے بی بی۔ پتہ ہے گامی اتنے دنوں سے کیوں نہیں آئی؟"

"کیوں نہیں آئی؟" بی بی گل نے پوچھا۔

اور ستاں بولی۔ "بے چاری کو پسلی کے دُرد نے چُوس کے ڈال دیا ہے۔"

"کب سے۔" بی بی گل پریشان سی ہو گئیں۔

ستاں بولی۔ "یہ تو مَیں نے نہیں پوچھا کہ کب سے پر لگتا ہے کہ آج بیچاری کا آخری دن ہے۔ آلی ہٹّی سے دوا لینے جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کیسی ہے گامی، بولی۔ بس چل چلاؤ لگتا ہے۔ ابھی ابھی تو زبان بھی بند ہو گئی تھی۔ پھر چمچے سے گرم گرم چائے منہ میں ٹپکائی، تو ذرا سی بولنے لگی، اور بی بی خُدا کی قسم، بیچاری لڑکی یہ بتا کر رونے لگی۔ اب سوچ تو بہُو کا یہ حال ہے تو بیٹے کا کیا حال ہوگا۔ میں تو کہتی ہُوں گامی خواہ مخواہ دونوں کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔"

"تو یہ بات ہے۔" بی بی گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر کیل پر سے بُرقع اُتار لیا اور بولیں۔ "چل ستاں، گامی کو اس کا صندوق دے آئیں۔ زندگی موت کا کوئی پتہ نہیں۔ بیماری موت کی نشانی ہوتی ہے۔ میں تو ہمیشہ ڈرتی رہتی ہوں کہ اگر کوئی اچانک مر جائے اور اس کی امانت میرے پاس رکھی رہ جائے تو مَیں اس کے وارثوں کو کیسے یقین دلاؤں گی کہ اس بکسے میں یہی کچھ تھا اور کچھ نہیں تھا۔"

ستاں چھابے پر ڈھکنا رکھ کر کھڑی تو ہو گئی۔ مگر بولی۔ "بی بی۔ ذرا سا دن ڈھل لے تو چلیں۔ ابھی تو دوپہر بھی نہیں ہوئی۔ گلیاں جل رہی ہیں، تجھے تکلیف ہو گی۔"

"اور اگر گامی اس سے پہلے چل دی؟" بی بی گل نے بُرقعے کا اگلا حصّہ ماتھے پر سے

اُلٹتے ہوئے کہا۔ "اگر اس کے بعد اس کی بہُو یا بیٹا یہ کہہ ڈالیں کہ بی بی سارا مال گھر میں رکھ آئی ہے اور خالی صندوق اُٹھا لائی ہے تو ———؟"

"ہائے ہائے بی بی۔ توبہ توبہ کرو۔" ستاں نے گامی کے صندوق پر سے کُنڈورا اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ "کسی کی موت آئی ہے کہ وہ تجھ پر تہمت باندھے۔ زبان جل کر کوئلہ نہ ہو جائے آن کی آن میں۔"

"نہیں ستاں۔" بی بی نے صندوق کا ایک کُنڈا پکڑ کر اسے ایک طرف سے اُٹھایا "سانس کا کوئی اعتبار نہیں، چل اُٹھ۔"

صندوق ستاں کے سر پر رکھ دیا گیا اور حویلی کے دروازے کو مقفّل کر کے دونوں گامی کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے لوگ برقعے میں لپٹی ہوئی خاتون کو آتا دیکھ کر دیواروں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے، بچّے ایک طرف ہٹ گئے۔ عورتوں نے بی بی گل کے برقعے کو پہچان کر "رد بلائیں، دور بلائیں" کہا اور ادب سے گزر گئیں۔

پھر یکایک زرد رنگ کی آندھی اتنے زور سے آئی اور یوں اچانک آئی کہ بی بی گل کا برقع پھُول کر کُپّا ہو گیا۔ اور ستاں کے قدم اکھڑے تو گامی کا صندوق دھڑ سے پتھّر کی ایک سِل پر جا گرا۔ آس پاس گھروں کے آنگنوں میں بکھرے ہوتے برتن دیواروں اور دروازوں سے ٹھَن ٹھَن ٹکرانے لگے اور مٹّی کے ذرّے سوئیوں کی طرح چہروں میں چُبھنے لگے۔

"واپس نہ چلیں بی بی؟" ستاں نے اُٹھتے ہوئے بڑی بے بسی سے پوچھا۔

"نہیں۔" بی بی گل بولیں۔ پھر اسے صندوق سر پہ اُٹھانے میں مدد دی تو ستاں بولی۔ "ہائے بی بی یہ دیکھو پتھّر کی سِل دو ہو کے رہ گئی ہے!"

"دیواروں کے ساتھ لگ لگ کر چلو۔" بی بی گل بولیں۔ "کتنی دُور ہے گامی

کا گھر؟"

"کچھ ایسا دُور تو نہیں ہے مگر ——"

یکایک بادل اس زور سے کڑکا کہ کچے مکان تانبے کی چادروں کی طرح بج اُٹھے۔

"حسبنا اللہ!" بی بی گل زور سے بولیں۔

ایک دم موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور گامی کے گھر پہنچنے تک دونوں یوں بھیگ گئیں کہ کھٹی کے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ لباس ان کے جسم سے چمٹا پڑتا تھا، اور بھیگا ہوا برقع تو ہوا کے تھپیڑوں سے سارے راستے تالیاں پیٹتا رہا۔

دونوں گامی کے کوٹھے میں داخل ہوئیں تو مہرا برقع دیکھ کر دوسری طرف سے نکل گیا۔ گامی کے سرہانے آلی بیٹھی چمچے سے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ دوا ٹپکا رہی تھی اور ایک پڑوسن آہستہ آہستہ گامی کے تلوے مل رہی تھی۔

بی بی گل کو دیکھ کر دونوں ہکا بکا سی رہ گئیں۔ پھر گامی کی مدھم آواز آئی۔

"بند کروں منہ؟ ختم ہو گئی دارو؟"

"ماسی!" آلی گامی پر جھک کر بولی۔ "ماسی دیکھو کون آیا ہے۔"

"کون آیا ہے؟" گامی نے پوچھا۔ "مہرا کدھر گیا؟"

"بی بی گل آئی ہیں ماسی!" آلی بولی۔

"ہائے میں مر جاؤں، کہاں ہے بی بی؟" گامی کے سارے جسم میں حرکت پیدا ہوئی، اور اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔

بی بی گل نے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بولیں "تم لیٹی رہو گامی۔ ہلو جلو نہیں۔ میں تو بس تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔"

مگر گامی سخت بے قرار ہو گئی تھی۔ "اسے آلی، اسے بی بی کو کسی اونچے پلنگ پر بٹھا، یا مجھے یہاں سے اٹھا کر نیچے لٹا دے۔ اری بی بی گل نہیں آئی ہے تیرے گھر میں فرشتہ اُترا ہے۔ مجھ سے پوچھو یہ بی بی کیا چیز ہے اب میری مشکل آسان ہو گئی ہے، اب مجھے سُورتیں بھی یاد آ گئی ہیں۔ اب میں ذرا سلیقے سے مروں گی۔ ہائے بی بی، تو میرے پاس چل کر آئی ہے۔ ارے بدنصیبو کہیں سے چینی نکالو۔ شربت گھول کر پلاؤ بی بی کو ——"

بی بی گل گامی کے پاس ہی بیٹھ گئیں "نہیں گامی، رہنے دو۔ میں تو بس تمہیں دیکھنے آئی ہوں اور تمہاری امانت تمہیں پہنچانے آئی ہوں۔ میں نے سوچا زندگی موت کا کوئی پتہ نہیں، تمہارا مال ہے تم تک پہنچ جاتے اور میں سُرخ رُو ہو جاؤں۔"

"ہائے بی بی۔ تُو نے میری خاطر کتنا کچھ کیا ہے۔" گامی بولی۔ "بس آ گیا صندوق میرے پاس، پہنچ گئی امانت۔ ستّاں اُٹھا کر لائی ہو گی۔ جیتی رہو ستّاں۔ اے بی بی، اللہ تجھے ایمان نصیب کرے۔"

کچھ دیر تک بی بی گل گامی کو تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر اسے کلمہ طیبہ پڑھتے رہنے کو کہا اور آخر میں پوچھا۔ "گامی، ایک بات کہوں بُرا تو نہیں مانو گی؟"

گامی نے اپنا ہاتھ بی بی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "تیری بات کا بُرا مان کر کیا مجھے دوزخ میں جانا ہے بی بی۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ۔" بی بی گل نے پوچھا "تمہارا صندوق تو تمہارے پاس پہنچ گیا۔ مگر اس کا کیا کرو گی؟ کسے دو گی یہ صندوق؟"

گامی نے جیسے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر اس کوشش میں ناکام ہو کر بولی۔ "ہائے بی بی میں مر جاؤں۔ تو بھی کیسی بھولی بادشاہ ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات

کا گھر؟"

"کچھ ایسا دُور تو نہیں ہے مگر——"

یکایک بادل اس زور سے کڑکا کہ کچے مکان تانبے کی چادروں کی طرح بج اُٹھے۔

"حسبنا اللہ!" بی بی گل زور سے بولیں۔

ایک دم موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور گامی کے گھر پہنچنے تک دونوں یوں بھیگ گئیں کہ کھل کے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ لباس ان کے جسم سے چمٹا پڑتا تھا، اور بھیگا ہوا برقع تو ہوا کے تھپیڑوں سے سارے راستے تالیاں پیٹتا رہا۔

دونوں گامی کے کوٹھے میں داخل ہوئیں تو مہرا برقع دیکھ کر دوسری طرف سے نکل گیا۔ گامی کے سرہانے آلی بیٹھی چمچے سے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ دوا ٹپکا رہی تھی اور ایک پڑوسن آہستہ آہستہ گامی کے تلوے مل رہی تھی۔

بی بی گل کو دیکھ کر دونوں ہکا بکا سی رہ گئیں۔ پھر گامی کی مدھم آواز آئی۔

"بند کر لوں منہ؟ ختم ہو گئی دارو؟"

"ماسی!" آلی گامی پر جھک کر بولی۔ "ماسی دیکھو کون آیا ہے۔"

"کون آیا ہے؟" گامی نے پوچھا۔ "مہرا کدھر گیا؟"

"بی بی گل آئی ہیں ماسی!" آلی بولی۔

"ہائے میں مر جاؤں، کہاں ہے بی بی؟" گامی کے سارے جسم میں حرکت پیدا ہوئی، اور اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔

بی بی گل نے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بولیں۔ "تم لیٹی رہو گامی۔ ہلو جلو نہیں۔ میں تو بس تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔"

مگر گامی سخت بے قرار ہو گئی تھی۔ "اے آلی، اے بی بی کو کسی اونچے پلنگ پر بٹھا، یا مجھے یہاں سے اٹھا کر نیچے لٹا دے۔ اری بی بی گل نہیں آئی ہے تیرے گھر میں فرشتہ اُترا ہے۔ مجھ سے پوچھو یہ بی بی کیا چیز ہے اب میری مشکل آسان ہو گئی ہے، اب مجھے سُورتیں بھی یاد آگئی ہیں۔ اب میں ذرا سلیقے سے مروں گی۔ ہائے بی بی، تو میرے پاس چل کر آئی ہے۔ ارے بدنصیبو کہیں سے چینی نکالو۔ شربت گھول کر پلاؤ بی بی کو——"

بی بی گل گامی کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ "نہیں گامی، رہنے دو۔ میں تو بس تمہیں دیکھنے آئی ہوں اور تمہاری امانت تمہیں پہنچانے آئی ہوں۔ میں نے سوچا زندگی موت کا کوئی پتہ نہیں، تمہارا مال ہے تم تک پہنچ جائے اور میں سُرخ رُو ہو جاؤں۔"

"ہائے بی بی۔ تُو نے میری خاطر کتنا کچھ کیا ہے۔" گامی بولی۔ "بس آگیا صندوق میرے پاس۔ پہنچ گئی امانت۔ ستاں اُٹھا کر لائی ہو گی۔ جیتی رہو ستاں۔ اے بی بی! اللہ تجھے ایمان نصیب کرے۔"

کچھ دیر تک بی بی گل گامی کو تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر اسے کلمۂ طیبہ پڑھتے رہنے کو کہا اور آخر میں پوچھا۔ "گامی، ایک بات کہوں بُرا تو نہیں مانو گی؟"

گامی نے اپنا ہاتھ بی بی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تیری بات کا بُرا مان کر کیا مجھے دوزخ میں جانا ہے بی بی۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ۔" بی بی گل نے پوچھا۔ "تمہارا صندوق تو تمہارے پاس پہنچ گیا مگر اس کا کیا کرو گی؟ کسے دو گی یہ صندوق؟"

گامی نے جیسے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر اس کوشش میں ناکام ہو کر بولی۔ "ہائے بی بی میں مر جاؤں۔ تو بھی کیسی بھولی بادشاہ ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات

ہے کہ اپنا صندوق کسے دوں گی۔ اسے اپنے بیٹے کو دوں گی اور کسے دوں گی۔"

باہر آسمان بالکل نیلا چرچ ہو رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ہوا یوں بند تھی، جیسے کبھی چلی ہی نہیں تھی۔